جلد ۶۹ جون ۱۹۶۸ء عدد ۴

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرِ سالانہ : ۷ روپے فی پرچہ : ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

# فہرست مضامین


| جلد ۶۹ | جون ۱۹۶۸ء مطابق ربیع الاول ۱۳۸۸ھ | عدد ۴ |
|---|---|---|





| چندہ سالانہ | ماہنامہ ترجمان القرآن | قیمت فی پرچہ |
|---|---|---|
| سات روپے | ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور | ۷۵ پیسے |

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اشارات

جس طرح افراد کے مابین تعاون اور باہمی امداد زندگی کے معمولات ہیں، بالکل اسی طرح قومیں بھی بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کی معاونت کرتی رہتی ہیں۔ آپس کا لین دین اور تعاون اجتماعی زندگی کا ایک خاصہ ہے۔ غیر ملکی امداد کا حصول کوئی ایسا خصوصی امتیاز نہیں جو صرف پاکستان کو حاصل ہوا ہو اور نہ یہ کوئی ایسی غیر معمولی سعادت ہے جس سے صرف اہلِ پاکستان ہی بہرہ مند کیے گئے ہوں۔

ایک باغیرت اور خوددار فرد بھی بعض اوقات دوسرے افراد سے امداد حاصل کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور وہ امداد دینے والے حضرات کا شکر گزار بھی ہوتا ہے، لیکن اس معاونت کے عوض کبھی اپنے ایمان، اپنے ضمیر اپنی غیرت اور اپنی خودداری کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی حال دنیا کی خوددار قوموں کا ہے۔ وہ اپنے بعض معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے دوست قوموں سے امداد طلب کرتی ہیں، اور اس مدد کے لیے وہ اُن کی ممنونِ احسان بھی ہوتی ہیں لیکن انہوں نے ایک ثانیہ کے لیے بھی کبھی اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ جذبۂ سپاس گزاری کے زیر اثر اپنی قومی حمیت، قومی غیرت اور قومی احساسات ہی کو محسن قوم کے استھان پر بھینٹ چڑھا دیں۔

احسان کا اعتراف انسانی زندگی کی بلاشبہ ایک قابلِ قدر خوبی ہے لیکن اس اعتراف کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کوئی فرد یا قوم اپنے افکار و نظریات اور اپنی اُن اخلاقی اقدار کو تیاگ دے جن کی وجہ سے کسی شخص کی انفرادیت یا کسی قوم کا قومی تشخص قائم ہوتا ہے۔ محسن کے کسی احسان کے اعتراف کی آبرومندانہ صورت یہ ہے کہ ہمیشہ اُس کی بھلائی اور خیر خواہی کا خیال رکھا جائے اور مصیبت میں اُس کی حتی الامکان دستگیری کی جائے۔ دُنیا میں احسانات کا بدلہ چکانے کی یہی ایک معقول صورت ہے۔ غیرت مند افراد اور خوددار

قوموں نے کسی فرد یا قوم کے احسان کے مقابلے میں ہمیشہ یہی روش اختیار کی ہے۔

---

تاریخ کا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قوم جو کسی دور میں خودداری، خود اعتمادی اور وقار کا پیکر خیال کی جاتی تھی، جسے اپنے معتقدات اور اپنے اخلاقی معیارات دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھے، وہ اب تھوڑی سی فوجی اور مالی امداد کے عوض اپنی متاعِ ایمان کو رہن رکھنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ آخر دنیا کی دوسری قومیں بھی بوقتِ ضرورت ایک دوسری سے اس نوعیت کی امداد لیتی رہتی ہیں، لیکن کیا ان میں سے کسی ایک قوم نے بھی اس امداد کے بدلے میں فکر کا کوئی ایسا انداز اور عمل کی کوئی ایسی روش اختیار کرنا گوارا کیا ہے جس سے اُن کا الگ قومی وجود ہی برباد ہو کر رہ جاتے؟ یہ بے حمیتی صرف مسلمان ممالک ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ جس قوم سے بھی فوجی۔ معاشی امداد حاصل کرتے ہیں اس کے ساتھ اُس کے افکار و نظریات اور اُس کی اخلاقی اقدار کو بھی اپنے ہاں راہ پانے کے پورے مواقع فراہم کر دیتے ہیں۔ انڈونیشیا، مصر، شام، الجزائر اور بعض دوسرے ملکوں میں اس روش کے بدترین نتائج ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ اور اب ہم بڑی تشویش کے ساتھ پاکستان کو اس انجام کی طرف بڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں بھی ایک مدت سے یہ بات گویا ایک قاعدے کے طور پر طے ہو گئی ہے کہ جو قوم بھی ہمیں تھوڑا سا اسلحہ یا ترقیات کے لیے کچھ ساز و سامان فراہم کر دے، ہم اُس کے ان احسانات کے اعتراف میں اس کی امداد کے ساتھ ساتھ اُس کے افکار و نظریات کا بھی بڑی عقیدت کے ساتھ استقبال کریں اور اس کو یہ مواقع بہم پہنچائیں کہ وہ اس امداد کے عوض یہاں جو فکری اور علمی گمراہیاں پھیلانا چاہے آزادی سے پھیلائے۔ آغاز میں امریکہ نے اپنے بعض سامراجی مفادات کے پیش نظر ہمیں کچھ مالی اور فوجی امداد بہم پہنچائی تو ہم اُس کے اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ اپنی قومی خودداری اور قومی غیرت کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ اُس نے دنیا کی بساطِ سیاست پر ہمیں بطور مہرہ چلایا اور بسا اوقات ہمیں ایسی روش اختیار کرنے پر مجبور کیا جس سے ہمیں ملی نقطۂ نظر سے شدید نقصان پہنچا مگر ہم نے اُس کے اس احسان کے بدلے اپنی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو بھی بدلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور اس ملک کو امریکی فکر و عمل کا نمونہ بنانے کے خواب دیکھنے لگے۔ امریکہ کی بے وفائی کے بعد ہمیں چین کا سہارا ملا تو اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ چین کے لیے ہمارے دلوں میں صرف جذبۂ سپاس گزاری ہی موجود

نہیں ہے بلکہ ہر طرف چین کے قصیدے پڑھے جا رہے ہیں، اس کے نظام کو نمونہ اور مثال بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اس کے لیڈر کو اپنا قومی ہیرو بنایا جا رہا ہے، اور اشتراکی لٹریچر کا ایک سیلاب ہے جو پورے ملک میں ایک طوفان کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

---

اہلِ پاکستان کا یہ غلامانہ طرزِ عمل کس بات کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں؟ اس سوال پر ہمارے ملک کے ہر حساس شہری کو غور کرنا چاہیے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل اِس افسوسناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم اب ایک ایسی قوم بن گئے ہیں جو ذہنی اعتبار سے مفلس اور اخلاقی اعتبار سے بالکل قلاش ہے۔ ہمارے پاس نہ تو فکر و نظر کا کوئی سرمایہ رہ گیا ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہوں اور نہ سیرت و کردار کا کوئی مضبوط ڈھانچہ رہ گیا ہے جس کے بل پر ہم کھڑے رہ سکتے ہوں۔ ہم اس وقت فکری اور اخلاقی اعتبار سے بالکل خلا میں جی رہے ہیں اور ہر وقت اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی طاقتور قوم آئے اور اس خلا کو اپنے تصورات اور اپنے اخلاقی معیارات سے پُر کر دے۔ کیونکہ ہم اپنی جگہ بالکل تہی دست اور تہی دامن ہیں۔ یہ صورتِ حال کسی قوم کے احساس کہتری یا دوسرے لفظوں میں اس کے ہلکے پن کو ظاہر کرتی ہے۔ جس طرح کسی ایک مقام کی ہوا ہلکی ہو کر اوپر کو اٹھتی ہے اور اردگرد کی بھاری ہوا کے لیے خود بخود جگہ خالی کر دیتی ہے جو تند و تیز طوفان کی صورت میں اس کی طرف یورش کرتی ہے، بالکل اسی طرح جب کسی قوم کا اپنے افکار و نظریات اور اپنے نظام اخلاق پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ انہیں بے وزن خیال کر کے انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیتی ہے تو اُس کے دل و دماغ میں خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پُر کرنے کے لیے باہر کے معتقدات اور باہر کے اخلاقی نظریات بپھری ہوئی موجوں کی طرح اُس کی طرف لپکتے اور خلا کو پُر کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ ہوائیں اگر فطری رفتار سے ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف چلتی رہیں تو وہ کسی تباہی کا باعث نہیں بنتیں لیکن جب خلا انہیں یورش کی دعوت دیتا ہے تو وہ شدید تھپیڑوں کی صورت میں اس مقام پر حملہ آور ہوتی ہیں اور خلا کو پُر کرنے کے بجائے طوفان اٹھا دیتی ہیں۔ یہی حال قوموں کے فکری اور اخلاقی خلا کا ہے۔ یوں تو دنیا میں قوموں کے مابین افکار و نظریات کے

تبادلے ہوتے ہی رہتے ہیں اور قومیں اپنے مزاج اور ضرورت کے تحت ایک دوسرے کے تصورات سے متاثر بھی ہوتی ہیں لیکن جب خلا کی صورت پیدا ہو جائے تو پھر یہ تصورات دھیمی رفتار سے آکر خلا کو پر نہیں کرتے بلکہ اُس قوم کے ذہنی افق اور اُس کے اخلاقی پس منظر پر ہلاکت خیز یورشیں برپا کرتے ہیں اور قومیں نئے افکار اور نئے ولولوں کے ساتھ کسی تعمیرِ نو میں منہمک ہونے کے بجائے شدید فکری اور اخلاقی انتشار کی شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

---

پاکستان کے حالات کا جب ہم اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ اصول یہاں سو فیصد درست دکھائی دیتا ہے۔ ہم غیر ملکی افکار یا غیر ملکی تجربات کی کوئی اچھی چیز دیکھ کر اُن سے جائز حد تک فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے بلکہ ہمارا طرزِ عمل تو اس بھکاری کا سا ہے جو کشکولِ گدائی لیے ہوئے مختلف قوموں کے سامنے مارا مارا پھرتا ہے اور جہاں سے بھی کوئی چیز مل جائے اُسے بڑھ کر قبول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اس کشکول میں مختلف نظریات کے بچے کھچے ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ملک میں دوسرے ممالک کے ساتھ ثقافتی دوستی کے لیے جو متعدد انجمنیں قائم ہیں اُن کے ناموں اور اُن کے کارناموں پر اگر نگاہ ڈالیں تو آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یہ ایک ایسا ملک ہے جو فکر و عمل کے اعتبار سے بالکل ایک ویرانہ ہے اور اس چٹیل میدان میں جو ادارہ یا شخص افکار و نظریات کے جو بیج چاہے بو دے کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔

---

کچھ مدت تک تو یہاں امریکہ کے الحاد اُس کی مادی تہذیب اور اس کی اخلاقی اباحیت کا چرچا ہوتا رہا۔ ہم نے اس وقت بھی ایک بار نہیں، متعدد بار اس کے زہریلے اثرات سے قوم کو آگاہ کیا۔ لیکن امریکہ کی محبت ہمارے ملک کے برسرِ اقتدار طبقوں کے دلوں میں اس حد تک جاگزیں تھی کہ انہوں نے ہماری ایک نہ سنی بلکہ اُلٹا ہمیں موردِ الزام ٹھیرایا گیا۔ اب وہ دَور گزر رہا تھا کہ یہ خطۂ پاک اشتراکی چین کے خیالات اور افکار کی زد میں آگیا۔ کوئی شک نہیں کہ چین نے بڑے نازک وقت میں بھارت کے مقابلے پر ہماری مدد کی ہے

ہم اُس کی اس معاونت کے لیے اُس کے شکر گزار ہیں۔ اُس نے ہماری بعض مالی دشواریوں میں بھی کچھ نہ کچھ ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ اُس کے اس تعاون کی بھی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ لیکن آخر یہ کس نوعیت کا جذبۂ سپاس گزاری ہے کہ ہم اس کے افکار و نظریات اور اُس کے اخلاقی فلسفے کو بھی اپنانا شروع کر دیں۔ عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر چین کو کل ہماری امداد کی ضرورت پیش آئے تو ہم بھی بڑے خلوص کے ساتھ اُس کی طرف اپنا دستِ تعاون بڑھائیں اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے اُس کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ اس کی خیر سگالی کا ایک ہی جائز بدلہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم بھی اُس کی خیر خواہی کریں۔ لیکن یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ہم اُس کی اِس امداد کے بدلے اس بات کو گوارا کرلیں کہ وہ یہاں آزادی کے ساتھ جن افکار و تصورات کو پھیلانا چاہے، پھیلاتا رہے؟ غیرت مند قومیں مالی امداد کے عوض اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کو نہیں بیچا کرتیں۔ یہ دراصل احسان مندی نہیں بلکہ غیرت و حمیت اور قومی خودداری کا فقدان ہے جس کی بدولت چینی اشتراکیت کی اشاعت کے لیے یہاں سارے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے ہیں خصوصاً یونیورسٹیوں اور کالجوں میں یہ لٹریچر اتنی تیزی کے ساتھ سرایت کر رہا ہے کہ سطح بین آنکھیں اس کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔ مشرقی پاکستان میں اس کی اشاعت کا دائرہ مغربی پاکستان سے بھی زیادہ وسیع اور اس کی رفتار غیر معمولی حد تک تیز ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ڈھاکہ یونیورسٹی کو ماؤ کی سرخ کتاب کے کئی ہزار نسخے بطور تحفہ دیئے گئے اور وہ شکریہ کے ساتھ قبول کر کے نوجوانوں میں پھیلا دیئے گئے۔ پی آئی اے کے جہازوں میں یہ لٹریچر مسافروں کی تواضع کے لیے کثرت سے پیش کیا جاتا ہے۔ بعض مواقع پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آدمی پاکستان میں نہیں بلکہ شاید اشتراکی چین میں سفر کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ماؤ کی تصویر کے بیج کثرت کے ساتھ نوجوانوں اور خاص طور پر طلبا کے سینوں پر آویزاں کیے جارہے ہیں گویا کہ اب یہ اُن کا قومی ہیرو ہے اور اسی کی عقیدت اور محبت ان کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ بعض سرپھروں نے تو ماہر کی چند شخصیتوں کے نام پر اپنے بچوں کے نام بھی رکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ پھر جو شخص بھی چین یاترا میں وہاں کے حالات کا بالکل سرسری سا اور زیادہ تر سرکاری نگرانی میں کیا ہوا مشاہدہ کر کے واپس لوٹتا ہے وہ اس ملک کی مدح ستائش میں اتنے مبالغہ آمیز بیانات دیتا ہے کہ آدمی کو اس ملک پر طلسم ہوشربا کا گمان ہونے لگتا ہے۔

یہ لوگ وہاں کی مادی ترقی کے افسانے تو بیان کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ یہ سُرخ انقلاب کس قیمت پر آیا ہے اور اس کی آمد کے ساتھ انسانیت اور انسانی اقدار کا کیا حشر ہوا ہے اور اس کی لائی ہوئی ترقیات نے انسان سے لیا کیا ہے اور اسے دیا کیا ہے۔ چین کے عشق میں سرشار سیاحوں کو اتنا ہوش ہی کہاں ہے کہ وہ کبھی یہ باتیں بھی سوچیں۔

---

ہماری اس نیازمندی و خود رفتگی کے جواب میں اگر چین کی طرف سے کچھ ہوا ہے تو بس اسی قدر کہ ہمارے صدرِ مملکت کے دورہ کے موقع پر اہلِ چین نے ان کا کئی میل لمبا جلوس نکالا اور ان کے اعزاز میں بہت سی ضیافتیں دیں۔ اس سے آگے بڑھ کر کیا کوئی شخص ایک مثال بھی اس امر کی پیش کر سکتا ہے کہ کسی چینی نے پاکستان سے واپس جا کر اس ملک کی مدح و ثنا میں کوئی قصیدہ پڑھا ہو؟ کیا اہلِ چین یہ گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ پاکستان کی طرف سے اُن کے ملک میں اسلامی نظریات کی اشاعت کی جائے؟ یا کوئی چینی پاکستان کے اسلامی لٹریچر کو وہاں درآمد کر کے پھیلائے؟ یا وہاں کا کوئی پریس اسلامی لٹریچر چھاپے اور اس کی اشاعت کرے؟ یا وہاں کے طلبہ اور عوام کے سینوں پر پاکستان کے بیج لگائے جائیں یا اس کے ساتھ پاکستان کی کسی شخصیت کے نام یا تصویر کے بیج آویزاں کیے جائیں اور اسے چینی قوم کا ہیرو بنانے کی کوشش کی جائے؟ ان باتوں پر عمل تو درکنار، ان کی محض تجویز، بلکہ ان کا تصور و خیال ہی اشتراکی چین کے سامنے پیش کیا جائے تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ پاکستان کے لیے ان لوگوں کے دل میں کتنی قدر و منزلت اور کتنی رواداری اور کتنی مخلصانہ وابستگی موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے معاملے میں چین کے اس رویّہ کی وجہ کیا ہے؟ کیا فی الواقع اس کی وجہ یہی ہے کہ افکار، نظریات، تہذیب، اخلاق اور اکابر انسانیت کے لحاظ سے ہم قطعی مفلس و بے مایہ ہیں جس کی وجہ سے چین کو ہم سے کوئی چیز لینے کی کوئی حاجت نہیں ہے؟ اور کیا ہم بھی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتے ہیں اور ہماری نگاہ میں چین ان سارے پہلوؤں سے مالا مال ہے جس کی وجہ سے ہم بھک منگے اس سے فوجی اور مادی امداد ہی نہیں، اقدار بھی اور ہیرو بھی اسی سے مانگ لانے کے محتاج ہیں؟ یہ سوال ایسا ہے جو ہر

پاکستانی کو اپنے ضمیر سے بھی پوچھنا چاہیے اور اپنے ملک کے چین پرستوں اور ماؤ پرستوں سے بھی اس کا جواب مانگنا چاہیے۔

---

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ چین پاکستان کے ساتھ اپنی دوستی کو صرف مادّی تعاون تک اور بین الاقوامی معاملات میں صرف دوستانہ سیاسی تعلقات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے کسی نظریۂ حیات یا کسی اخلاقی معیار کو اپنانے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں اور نہ اس ملک کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی عقیدت اور ذہنی غلامی اختیار کرنے پر آمادہ ہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم بھی اس قوم کی رفاقت کو صرف ان معاملات تک ہی محدود نہیں رکھتے؟ آخر ہم چین کے دستِ تعاون کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر اس واضح حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی اسلام کی شکل میں ایک مستقل ضابطۂ حیات موجود ہے جس کی موجودگی ہمیں تمام دوسرے ضابطوں سے بے نیاز کر دیتی ہے؟ ہمارا اپنا ایک فلسفۂ زندگی ہے جو دوسرے تمام فلسفوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ ہماری اپنی ایک تاریخ ہے جس کے ابواب دنیا کی ساری اقوام کے کارناموں سے کہیں زیادہ روشن اور تابندہ ہیں۔ ہمارے پاس اپنے ہیرو ہیں جن کے درجے اور مرتبے کے ہیرو دنیا کی کسی قوم کو میسّر نہیں ہیں۔ اس عظیم ملّی سرمائے کی قدر ہمارے دل میں ہوتی تو ہمارا سر فخر سے اونچا ہوتا نہ کہ ہمارا ہاتھ ہر ایک کے آگے بھیک مانگنے کے لیے پھیلتا۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہوئے بغیر ہم ایک ایسے نظریۂ زندگی کو کس طرح اپنا سکتے ہیں جو بنیاد سے لے کر جزئیات تک ہمارے پورے تصورِ حیات سے متصادم ہو؟

کوئی قوم اگر وقتی مصالح، سیاسی حالات یا بین الاقوامی مشکلات کے دباؤ سے ہماری دوستی کی ضرورت محسوس کرے اور ہماری امداد پر آمادہ ہو جائے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اُسے فکر و عمل میں سراپا خیر سمجھ کر اُس کی تقلید کرنے لگیں۔ ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم نظامِ حیات کے معاملے میں کوئی ایسی تہی دامن قوم نہیں ہیں کہ ہمارے دامن میں جو کچھ ڈال دیا جائے ہم اُسے بڑھ کر سینے سے لگا لیں۔ ہم بھی اپنے پاس افکار و اعمال کا ایک بیش قیمت سرمایہ رکھتے ہیں اس بنا پر کسی دوسری قوم کے نظریات اپنانے سے پہلے ہمیں اس بات کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے کہ ہم باہر سے جن تصورات یا

جن اقدار کو اخذ کر رہے ہیں وہ ہمارے اس سرمائے کے لیے تو نقصان دہ ثابت نہیں ہونگی۔

اس نقطۂ نظر سے ہم جب صورتِ حال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے بڑے تلخ حقائق آتے ہیں۔ ان صفحات میں ہم اپنی قوم کے سنجیدہ طبقوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

---

اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا چین کی اشتراکیت محض غربت اور افلاس دُور کرنے کی ایک مؤثر تدبیر ہے؟ اگر اس کی حیثیت صرف تدبیر کی سی ہوتی تو اس کی افادیت پر غور کر کے اس کے بعض اچھے اجزاء سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ لیکن ماؤ کی جو تصریحات وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں اُن کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ چینی اشتراکیت بھی مارکسی اشتراکیت کی طرح ایک مکمل نظامِ حیات ہے محض کچھ معاشی مسائل کے حل کی ایک تدبیر نہیں ہے۔ یہ پورا نظام دراصل ایک اساسی تصور کی عملی تعبیر ہے جس کے ہر شعبے بلکہ ہر ریشے میں مادی فلسفہ پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔ مافوق الطبیعی نظریات سے لے کر زندگی کے معمولی سے معمولی جزئیات تک ہر چیز مادی نظریۂ حیات کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ اس حقیقت کا واضح اعتراف ماؤ نے خود اپنی متعدد تحریروں میں کیا ہے۔ اپنی لال کتاب یعنی "تعلیمات ماؤزے تنگ" میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ "کمیونزم پرولتاری نظریے کا ایک مکمل نظام اور ایک نیا اجتماعی نظام ہے۔ یہ ہر کسی دوسرے نظریاتی اور اجتماعی نظام سے جدا ہے اور انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ جامع، ترقی پسند، انقلابی اور اعتدال پسند نظام ہے"۔ (ص ۲۷)

عقل باور نہیں کر سکتی کہ دنیا کی کوئی قوم اس قدر ہمہ گیر نظام کی علمبردار بن کر اٹھے اور پھر وہ اپنے ہاں کسی ایسے فکری واعتقادی اور معاشرتی نظام کو گوارا کرے جو اس سے بالکل مختلف ہو۔ اس نوعیت کے کسی انقلاب انگیز اور ہمہ گیر نظام کا قیام کسی دوسرے نظام کے بلیے پر ہی ممکن ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اشتراکی نظام کچھ مدت تک بعض مصالح کے تحت اسلام سمیت تمام مذاہب و ادیان سے براہ راست تعرض نہ کرے لیکن اس کے بقا، اس کی توسیع و ترقی اور اس کی مکمل علمبرداری کے لیے یہ چیز ازبس ضروری ہے کہ جس مقام پر بھی وہ پھیلنا چاہتا ہو وہاں ہر دوسرے موجود اور مدمقابل نظام کو فنا کر دے۔ اشتراکی

رہنماؤں نے اپنی ایک تحریر میں اسے صاف طور پر بیان کیا ہے:

"یہ عین ممکن ہے کہ سامراج اور جاگیرداری کو شکست دینے کے لیے ہمیں تصورات کے بعض شیدائیوں اور مذہب سے وابستگی رکھنے والوں سے وقتی طور پر اتحاد کرنا پڑے لیکن ہم اُن کے تصورات اور اُن کے مذہبی عقائد سے قطعاً اتفاق نہیں کر سکتے۔"

"اشتراکیوں کو اس بات کا پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ جُوں جُوں اس انقلاب کے اثرات وسیع ہونگے اسی نسبت سے مذہب کا خاتمہ ہو گا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ رفتار سست ہو لیکن مذہب کی موت یقینی امر ہے۔"[1]

---

اشتراکی چین نے مسلمانوں اور ان کے مذہب کے ساتھ یہی معاندانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اس کے وہی نتائج برآمد ہوئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

چین میں اس وقت جو مسلمان آباد ہیں ان کی کثیر تعداد اُن عرب، ترک اور ایرانی تاجروں کی اولاد پر مشتمل ہے جو ساتویں صدی اور چودھویں صدی کے درمیان اس ملک میں آباد ہوئے۔ ان لوگوں نے زیادہ تر ہنز (HANS) کے قبیلے میں شادیاں کیں۔ اسی بنا پر یہ قبیلہ اسلام کا علمبردار اور اس کی مقدس روایات کا امین خیال کیا جاتا ہے۔ آج سے تیس برس پیشتر ۱۹۳۸ء کی مردم شماری کے مطابق چین میں مسلمانوں کی تعداد قریب قریب پانچ کروڑ اور اُن کی مساجد کی تعداد ۴۲۳۲۱ تھی۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں جب اشتراکی حکومت نے آبادی کا جائزہ شائع کیا تو اس میں چینی مسلمانوں کی تعداد صرف ایک کروڑ اور مساجد کی تعداد ....۴ رہ گئی۔ یہ چار کروڑ مسلمان آخر کہاں گئے؟ کیا انہیں آسمان نے اُچک لیا یا زمین انہیں نگل گئی؟ اگر ۱۹۳۸ء میں ان کی تعداد ۵ کروڑ تھی تو ۱۹۵۲ء میں انہیں کم از کم سات کروڑ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ تعداد بڑھنے کے بجائے حیرت انگیز حد تک کم ہو گئی ہے۔ یہ صورتِ حال ہر مسلمان

---

[1] YU HSIANG AND LIU CHUNG-WANG, THE CORRECT RECOGNITION AND HANDLING OF RELIGION.

کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ وہ اشتراکیت کے طرزِ عمل پر غور کرے۔

---

چین کے مسلمان نہ صرف ذہین اور قابلِ اعتماد تاجر ہیں بلکہ بڑے نڈر سپاہی بھی ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ماؤ نے اوّل اوّل مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے اس طرزِ عمل کے پیچھے دو مقاصد کارفرما تھے۔ ایک یہ کہ مشرق میں اشتراکی چین کے توسیعی عزائم کے لیے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا نہایت ضروری تھا۔ دوسرے ہنز جیسی جنگجو نسل کی خدمات کے بغیر ملک کے اندر کوئی مضبوط اشتراکی حکومت قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس بنا پر آغاز میں ماؤ نے مسلمانوں کے جذبات کی کسی حد تک پاسداری کی اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اشتراکی انقلاب اُن کے مذہبی عقائد پر قطعاً اثر انداز نہ ہوگا بلکہ انہیں اپنے مذہبی احکام بجا لانے کی پوری آزادی ہوگی۔ مسلمانوں نے ماؤ کے ان دلفریب وعدوں پر اعتماد کر کے اُس کے لیے ہر قسم کا ایثار کیا۔ اشتراکی انقلاب کے لیے جو فوج تیار کی گئی اس میں کئی ایک رجمنٹیں پوری کی پوری مسلمان سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔

لیکن چونکہ اشتراکیت کے علمبرداروں کی نیت درست نہ تھی اس لیے انہوں نے شروع ہی سے بڑی عیاری کے ساتھ ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جو مسلمانوں کے لیے دینی نقطۂ نظر سے بڑا مہلک اور تباہ کن تھا۔ اشتراکیت کے ان شیدائیوں کی گہری چالبازیوں کا اندازہ اس ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ماؤ نے شمال مغرب میں رہنے والی مسلم آبادی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں اس خطے میں ایک بااختیار مسلم حکومت کے قائم کرنے میں مدد دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اُس کے تمدن کی حفاظت کا بھی التزام کرے گا۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں جب اس وعدہ کی تکمیل کا وقت آیا تو ماؤ نے اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں کو حکومت خود اختیاری قائم کرنے کی اجازت نہ دی بلکہ انہیں نسلی امتیاز کی بنیاد پر منظم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو دینِ حق سے برگشتہ کرنے کے باقاعدہ منصوبے بنائے گئے۔ مکاتب اور مسجدیں اشتراکیت کی غیر اسلامی سرگرمیوں کا ہدف سب سے پہلے بنیں اور دین کے ان مقدس مراکز کو یا تو بند کر دیا گیا یا انہیں تھیئٹر اور لائبریریوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں

تو یہ حکم ملا کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی ایسی تاویلات کریں کہ اشتراکیت اور اسلام ایک دوسرے سے بکسر ہم آہنگ ہو جائیں اور اُن میں کوئی بُعد و بیگانگی باقی نہ رہے اور مسلمان کسی مرحلہ پر بھی یہ محسوس نہ کریں کہ وہ اشتراکیت کی پیروی میں اسلام کے کسی اصول کو توڑ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت کا نقش بٹھانے اور اس کی محبت جاگزیں کرنے کے بجائے انہیں اشتراکیت کا علمبردار بلکہ پرستار بنانے پر زور دیا جانے لگا۔ چنانچہ مسلم اکثریت کے ایک صوبے کی انقلابی کمیٹی نے یہ طے کیا:

"اس صوبے کی حکومت، جماعت اور اس کے مالی وسائل اور ثقافتی اور تہذیبی قوتیں سب اس اشتراکی کمیٹی کے ہاتھ میں مرتکز ہیں۔ ہر فرد کو اپنا سارا زور اس انقلاب کو مستحکم کرنے اور پیداوار بڑھانے پر صرف کرنا چاہیے۔ پھر ہم میں سے ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہم انقلاب دشمن طاقتوں کو بڑی سختی کے ساتھ دبائیں اور ماؤزے تنگ کی تعلیمات کے مطالعہ اور ان سے عملی فائدہ اٹھانے کے لیے نئے نئے معیار قائم کریں"[1]

---

ماؤ اور اس کے ساتھیوں کا اسلام کے بارے میں یہ طرزِ عمل اور اپنے کیے ہوئے وعدوں کی یہ بے حرمتی کوئی ایسی باتیں نہیں جنہیں عقل ماننے پر آمادہ نہ ہو سکتی ہو۔ اشتراکیت کے یہ سارے کارنامے اُس کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اپنے وعدوں کا انہیں اس لیے کوئی پاس نہیں کہ جس فلسفے پر وہ ایمان رکھتے ہیں اُس کی رو سے کوئی فعل بھی اخلاقی اعتبار سے اپنی کوئی مستقل قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اُن کے نزدیک ہر وہ کام جائز ہے جس سے اشتراکیت کی راہ ہموار ہو سکتی ہو۔ اگر مسلمانوں سے خوش کُن وعدے کر کے انہیں بڑی کامیابی سے اس نظام کا آلۂ کار بنایا جا سکتا ہو تو وعدے کرنے میں قطعاً کسی تامّل سے کام نہ لینا چاہیے۔ البتہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کی تکمیل بھی کی جائے۔ اگر انہیں پورا کرنے سے اشتراکی مقاصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو انہیں بڑی بے تکلفی سے رد کر دینا چاہیے کیونکہ اصل چیز تو مقصد کا حصول ہے۔ ہر وہ ذریعہ درست اور جائز ہے جو مقصد کے لیے مفید اور کارآمد ہو اور ہر وہ بات غلط اور ناجائز ہے جس سے مقصد کو نقصان پہنچتا ہو۔

---

[1] پیکنگ ریویو، جلد ۹ ہم۔ شمارہ ۴۴ ص ۲۳

اس بنا پر اگر آغاز میں مسلمانوں کو اشتراکیت کا ہمنوا بنانے کے لیے اُن سے مذہبی تحفظات کے کچھ وعدے کیے گئے تھے تو اُن کی حیثیت محض ایک تدبیر کی تھی۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اُن کی تکمیل بھی کی جائے۔ اُن سے وقتی طور پر جو کام لینا مقصود تھا وہ لیا جا چکا ہے اور اب اُن کے لیے معقول اور سیدھی راہ یہی ہے کہ وہ اسلام کو تیاگ کر پوری یکسوئی کے ساتھ اشتراکیت کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال لیں۔ ماؤ اور اُس کے ساتھیوں نے کچھ مدت تک تو بالواسطہ اور چھپے ہوئے طریقوں سے اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن تازہ ثقافتی انقلاب (CULTURAL REVOLUTION) کے بعد جب اُس نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کر لیا تو مسلمانوں سے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ اسلام کو چین کے اشتراکی نظام میں زندہ رہنے کا قطعاً حق نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کی تعلیمات ماوزے تنگ کے فلسفۂ انقلاب سے متصادم ہیں۔ اس نوعیت کی ایک تنبیہ دسمبر ۱۹۶۷ء کے ترجمان القرآن میں ہم نقل کر چکے ہیں۔

---

ماؤ نے اپنی تصنیفات میں مختلف زاویوں سے اس موضوع پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکی تحریک کو اتنا مضبوط، اس کے اثرات کو اتنا ہمہ گیر اور اس کے نظم کو اتنا سخت بنا دیا جائے کہ قومی اقلیتیں (NATIONAL MINORITIES) خود بخود اس میں تحلیل ہو کر رہ جائیں، یا اگر زندہ بھی رہیں تو اُن کا قطعاً کوئی وزن باقی نہ رہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی اقلیت اتنی سخت جان ہو کہ وہ ان سارے صدمات کو سہہ کر بھی زندہ رہنے کی جدوجہد کرے تو پھر اسے مٹا دیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا۔ اشتراکیت کے تند و تیز دھارے نے اُنہیں اس شدت کے ساتھ اپنی لپیٹ میں لیا کہ پانچ کروڑ کی مضبوط اقلیت کا ایک حصہ خود چین کے سرکاری اعداد و شمار کی رو سے اشتراکیت کے طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ باقی ماندہ جن مسلمانوں نے مذہب کی بنیاد پر اپنے تحفظ کی کوشش کی اور مسجدوں کے ساتھ وابستہ رہنا چاہا اور اکل و شرب اور نکاح و طلاق کے معاملے میں حلال و حرام کے درمیان امتیاز پر اصرار کیا، انہیں بزورِ قوت دبا دیا گیا۔ ان بچے کھچے افراد کے مذہبی احساسات کو مردہ کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ فیکٹریوں اور کارخانوں

میں کام کرنے والے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ دوپہر کے وقت وہی کھانا کھائیں جو غیر مسلموں کو کھانے کے لیے دیا جاتا ہے ۔ ان کی عورتوں کو گھروں سے نکال کر اجتماعی زندگی کے مختلف مراکز میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا گیا ۔ پھر نہ صرف اُن کے چہروں سے نقاب نوچے گئے بلکہ انہیں تمام ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر شریک کیا جانے لگا ۔ عمل کے یہ مختلف محور بدلنے کے ساتھ اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا گیا کہ مسلمانوں کے فکر و نگاہ کے زاویے بھی یکسر بدل کر رکھ دیئے جائیں ۔ انقلاب کے آغاز میں تو ساری کوشش اس بات پہ صرف کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ مادہ کی اشتراکی تعلیمات درحقیقت اسلامی تعلیمات ہی ہیں ، اِن دونوں کے مابین کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ اور چین کا یہ عظیم رہنما جو کچھ کر رہا ہے وہ اسلام کی روح کے عین مطابق ہے ۔ چنانچہ ان دونوں کے اصول و مبادی کو ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ کر کے دکھانے کے لیے کئی ایک سرکاری اور نیم سرکاری ادارے قائم ہوئے جنہوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو موڑ توڑ کر اشتراکیت کے سانچوں میں ڈھالنے کی بےحد کوشش کی ۔ لیکن چونکہ ان دونوں کے درمیان اختلاف کی نوعیت اتنی واضح اور ہمہ گیر تھی کہ کسی طرح بھی ان کے درمیان مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی تھی ، اس لیے مسلمان جلد ہی ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے ۔ بعض چیزوں کو تو انہوں نے شدید مجبوری کے تحت قبول کر لیا لیکن اُن کی معاشرتی زندگی کے بعض ایسے نازک معاملات بھی تھے جن میں وہ اشتراکیت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ پاتے تھے ، کیونکہ ان کی جڑیں ان کے احساسات میں پیوست تھیں ۔ اس لیے وہ اس بات پر مُصر تھے کہ وہ انہیں جوں کا توں قائم رکھیں گے ۔ یہ صورتِ حال اشتراکیت کے لیے ناقابلِ برداشت تھی ۔ چنانچہ انہیں زبردستی تبدیل کرنے کی طرف پوری توجہ دی جانے لگی اور جن لوگوں نے بھی مزاحمت کی ان کا قوت سے خاتمہ کر دیا گیا ۔

---

دنیا کا ہر انقلاب دو سہاروں پر آتا ہے ۔ تعلیمات اور صاحبِ تعلیمات ۔ مجرّد تعلیمات سے ممکن ہے لوگوں کے افکار و تصورات میں کچھ تبدیلی آ جائے لیکن عالمِ واقعات میں تغیر کے لیے یہ بات اشد ضروری

ہے کہ کوئی ایسی انقلاب انگیز شخصیت بھی سامنے آئے جو عوام کی محبت اور عقیدت کی محور ہو اور جس کے سحر کے زیر اثر وہ ہر قسم کی قربانیاں کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اسی وجہ سے دنیا میں جو بھی انقلابی تحریک اٹھتی ہے وہ جہاں نئے نئے نظریات کا پرچار کرتی ہے وہاں ایک شخصیت کو بھی اُبھار کر سامنے لاتی ہے تاکہ عوام ان افکار کو قبول کرنے کے ساتھ ہی اُس شخصیت کی قیادت میں اس انقلاب کے لیے عملی جدوجہد شروع کریں۔ اس شخصیت کی حیثیت ایک عام رہنما یا قائد کی نہیں ہوتی بلکہ انقلابی تعلیمات کے شارح اور ترجمان کی سی ہوتی ہے اور اس کی ذات ہی اس تحریک کو سب سے زیادہ قوت فراہم کرتی ہے۔

اسلام میں یہ مقام صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ اُن کی مقدس ذات ہی مسلمانوں کی عقیدت و محبت کا اصل مرکز و محور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں حضورؐ کی محبت کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور امت کے دوسرے صلحا اور آئمہ کی محبت بھی جاگزیں ہے، لیکن ان کی محبت کی اصل وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ یہ حضرات اُن کی محبت کے اصل مرکز سے ایک خاص نسبت رکھتے ہیں۔ اور یہ حضورؐ کے جاں نثار فدائی اور آپ کی تربیت کے بہترین نمونے ہیں۔ اشتراکیت نے خاص طور پر چین میں ماؤ کی ذات کو اسی طرح عقیدت کا مرکز بنایا ہے جس طرح اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مرکز عقیدت ہے، اور ماؤ کے کلام کو وہی مقام دیا ہے جو اسلام میں کلام اللہ کا مقام ہے۔ اس کا ہر قول تنقید سے بالا ہے۔ اس کا ہر فعل خطا سے پاک اور قابل تقلید ہے۔ اُس کی ذات اشتراکیت کا ایک بلند ترین نمونہ ہے۔ بچہ بچہ اس کے ملفوظات کی تلاوت کرتا پھر رہا ہے۔ اس کی کتاب ہر معاملہ میں سرچشمۂ ہدایت قرار دی جا رہی ہے۔ اس کی تصویر جگہ جگہ اس شان سے آویزاں کی جا رہی ہے کہ مشرکین نے شاید اپنے معبودوں کی تصویریں بھی اس کثرت سے کبھی نہ لگائی ہوں گی۔ آپ چین کا کوئی رسالہ، اخبار یا کتاب اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ ماؤ کی عظمت اور برتری کا نقش عوام کے دل و دماغ پر نہایت گہرے طور پر ثبت کیا جا رہا ہے۔ اور انہیں یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ یہ وہ عظیم ہستی ہے جو تمہاری فلاح و کامرانی کی واحد ضامن ہے۔ جس کی غیر مشروط اطاعت ہی میں تمہاری کامیابی کا راز مضمر ہے۔ یہ ہستی جو کچھ کہتی اور جو کرتی ہے وہی اشتراکی چین بلکہ ساری دنیا کے لیے صحیح اور برحق ہے اور جو کچھ اس کے فرمودات یا اعمال کے خلاف ہے وہ سراسر

باطل ہے۔

---

ممکن ہے چین کی دوسری اقوام کے لیے ماؤ کی ذات کو اس حیثیت سے قبول کرنا کوئی اتنا کڑا اور شدید امتحان نہ ہو جتنا کہ مسلمانوں کے لیے ہے۔ ان کے لیے مرکزِ عقیدت کی یہ تبدیلی کفر ہے جسے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ اُن کے عقیدے میں قرآن مجید کے فیصلے ہی سو فیصد صحیح اور برحق ہیں اور حضور سرورِ دوعالم کے ارشادات و اعمال ہی حق و باطل کے درمیان تمیز کا آخری اور قطعی معیار ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انہیں ماؤ کی ذات کا پرستار بنانا اور انہیں ذہنی اور جذباتی اعتبار سے اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ حق و باطل کے فیصلے کے لیے ماؤ کی طرف رجوع کریں ایک ایسا اقدام ہے جو اُن کی روحانی موت کے مترادف ہے۔ آغاز میں تو مسلمانوں نے اسے محسوس نہ کیا اور اشتراکیت کو بیرونی استعمار اور گھر کی سرمایہ داری و جاگیرداری سے نجات کی ایک وقتی تدبیر سمجھ کر اس کا ساتھ دیا۔ لیکن اب جبکہ ماؤ کے خیالات اور اس کی ذات کو پوری طرح لوگوں کے ذہنوں پر مسلط کیا جا رہا ہے اور وہ اس بات پر مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ انہیں اگر اشتراکی چین میں رہنا ہے تو ماؤ کے پرستار اور مومن بن کر رہیں، ان حالات میں دنیا انہیں تنگ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ماحول نے انہیں اتنا بے بس کر دیا ہے کہ اُن کے لیے نجات کی اب کوئی راہ بھی باقی نہیں رہی۔

---

اشتراکیت اور تشدّد دونوں لازم ملزوم ہیں۔ دنیا کا جو گروہ بھی کسی غیر فطری نظام کو عوام پر مسلط کرنے کا عزم لے کر اٹھے گا وہ لازمی طور پر تشدّد سے کام لے گا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ کبھی انقلاب کا یہ معقول راستہ اختیار نہیں کر سکتا کہ لوگوں کو پہلے فکری اعتبار سے اپنا ہمنوا بنائے اور پھر اکثریت کے بل بوتے پر نظام حیات میں تبدیلی لائے۔ غیر فطری نظام ہمیشہ جبر کے سہارے آگے بڑھتا اور انقلابات لاتا ہے۔ اس کے افکار کو سب سے پہلے بڑے ہی مصنوعی طریقوں سے عوام میں پھیلایا جاتا ہے۔ پھر بڑے عجیب و غریب ہتھکنڈوں کے ذریعے انقلاب کے قائد کو عظیم شخصیت بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اُس کے

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

# تفہیم القرآن

## الممتحنہ

نام | اس سورہ کی آیت نمبر ۱۰ میں حکم دیا گیا ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں ان کا امتحان لیا جائے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام الممتحنہ رکھا گیا ہے۔ اس کا تلفظ ممتحَنہ بھی کیا جاتا ہے اور ممتحِنہ بھی۔ پہلے تلفظ کے لحاظ سے معنی ہیں "وہ عورت جس کا امتحان لیا جائے" اور دوسرے تلفظ کے لحاظ سے معنی ہیں "امتحان لینے والی سورۃ"۔

زمانۂ نزول | اس میں دو ایسے معاملات پر کلام فرمایا گیا ہے جن کا زمانہ تاریخی طور پر معلوم ہے۔ پہلا معاملہ حضرت حاطِب بن ابی بَلْتَعَہ کا ہے جنہوں نے فتح مکہ سے کچھ مدت پہلے ایک خفیہ خط کے ذریعہ سے قریش کے سرداروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارادے کی اطلاع بھیجی تھی کہ آپ ان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اور دوسرا معاملہ اُن مسلمان عورتوں کا ہے جو صلح حُدَیبیہ کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے لگی تھیں اور ان کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شرائطِ صلح کی رُو سے مسلمان مردوں کی طرح کیا ان عورتوں کو بھی کفار کے حوالہ کر دیا جائے؟ اِن دو معاملات کے ذکر سے یہ بات قطعی طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ یہ سورہ صلح حُدَیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی دَور میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا معاملہ بھی ہے جس کا ذکر سورۃ کے آخر میں آیا ہے، اور وہ یہ کہ جب عورتیں ایمان لا کر بیعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپ ان سے کن باتوں کا عہد لیں۔ اس حصے کے متعلق بھی قیاس یہی ہے کہ یہ بھی فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوا ہے، کیونکہ فتح مکہ کے بعد قریش کے مردوں کی طرح ان کی عورتیں بھی بہت بڑی تعداد میں بیک وقت داخلِ اسلام ہونے والی

تھیں اور اسی موقع پر یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ اجتماعی طور پر ان سے عہد لیا جائے۔

**موضوع اور مباحث** اس سورۃ کے تین حصے ہیں:

پہلا حصہ آغازِ سورۃ سے آیت ۹ تک چلتا ہے اور سورۃ کے خاتمہ پر آیت ۱۳ بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے اس فعل پر سخت گرفت کی گئی ہے کہ انہوں نے محض اپنے اہل و عیال کو بچانے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت اہم جنگی راز سے دشمنوں کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی جسے اگر بروقت ناکام نہ کر دیا گیا ہوتا تو فتح مکہ کے موقع پر بڑا کشت و خون ہوتا، مسلمانوں کی بھی بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوتیں، قریش کے بھی بہت سے وہ لوگ مارے جاتے جو بعد میں اسلام کی عظیم خدمات انجام دینے والے تھے، وہ تمام فوائد بھی ضائع ہو جاتے جو مکہ کو پرامن طریقہ سے فتح کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے، اور اتنے عظیم نقصانات صرف اس وجہ سے ہوتے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اپنے بال بچوں کو جنگ کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس شدید غلطی پر تنبیہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تمام اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ کسی مومن کو کسی حال میں اور کسی غرض کے لیے بھی اسلام کے دشمن کافروں کے ساتھ محبت اور دوستی کا تعلق نہ رکھنا چاہیے اور کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو کفر و اسلام کی کشمکش میں کفار کے لیے مفید ہو۔ البتہ جو کافر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عملاً دشمنی اور ایذا رسانی کا برتاؤ نہ کر رہے ہوں ان کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرا حصہ آیات ۱۰-۱۱ پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک اہم معاشرتی مسئلے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو اس وقت بڑی پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔ مکہ میں بہت سی مسلمان عورتیں ایسی تھیں جن کے شوہر کافر تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ پہنچ جاتی تھیں۔ اسی طرح مدینہ میں بہت سے مسلمان مرد ایسے تھے جن کی بیویاں کافر تھیں اور وہ مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ ان کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ان کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ فرما دیا کہ مسلمان عورت کے لیے کافر شوہر حلال نہیں ہے، اور مسلمان مرد کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ مشرک

بیوی کو اپنے نکاح میں رکھے۔ یہ فیصلہ بڑے اہم قانونی نتائج رکھتا ہے جن کی تفصیل ہم آگے اپنے حواشی میں بیان کریں گے۔

تیسرا حصہ آیت ۱۲ پر مشتمل ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو عورتیں اسلام قبول کریں اُن سے آپ اُن بُری بڑی بُرائیوں سے بچنے کا عہد لیں جو جاہلیت عرب کے معاشرے میں عورتوں کے اندر پھیلی ہوئی تھیں اور اس بات کا اقرار کرائیں کہ آئندہ وہ بھلائی کے اُن تمام طریقوں کی پیروی کریں گی جن کا حکم اللہ کے رسول کی طرف سے ان کو دیا جائے۔

---

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

اَے[1] لوگو جو ایمان لاتے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آغاز ہی میں اُس واقعہ کی تفصیلات بیان کر دی جائیں جس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں تاکہ آگے کا مضمون سمجھنے میں آسانی ہو۔ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے اور ابن عباس، مجاہد، قتادہ، عُروہ بن زبیر وغیرہ حضرات کی متفقہ روایت بھی یہی ہے کہ ان آیات کا نزول اُس وقت ہُوا تھا جب مشرکین مکہ کے نام حضرت حاطِب بن ابی بلتعہ کا خط پکڑا گیا تھا۔

قصہ یہ ہے کہ جب قریش کے لوگوں نے صلح حُدَیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں، مگر چند مخصوص صحابہ کے سوا کسی کو یہ نہ بتایا کہ آپ کس مہم پر جانا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مکہ معظمہ سے ایک عورت آئی جو پہلے بنی عبدالمطلب کی لونڈی تھی اور پھر آزاد ہو کر گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔ اس نے آ کر حضورؐ سے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور کچھ مالی مدد مانگی۔ آپ نے بنی عبدالمطّلب اور بنی المطّلب سے اپیل کر کے اس کی حاجت پوری کر دی۔ جب وہ مکہ جانے لگی تو حضرت حاطب بن ابی بَلتَعہ اس سے ملے اور اس کو چپکے سے ایک خط بعض سردارانِ مکہ کے نام دیا اور دس دینار دیے تاکہ وہ راز فاش نہ کرے اور چھپا کر یہ خط اُن لوگوں تک پہنچا دے۔ ابھی وہ مدینہ سے روانہ ہی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع فرما دیا۔ آپ نے فوراً حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت مِقداد بن اَسود کو اس کے پیچھے بھیجا اور حکم دیا کہ تیزی سے جاؤ۔ روضۂ خاخ کے مقام پر مدینہ

سے ۱۲ میل بجانب مکہ، تم کو ایک عورت ملے گی جس کے پاس مشرکین کے نام حاطب کا ایک خط ہے۔ جس طرح بھی ہو اس سے وہ خط حاصل کرو۔ اگر وہ دے دے تو اسے چھوڑ دینا۔ نہ دے تو اس کو قتل کر دینا۔ یہ حضرات جب اس مقام پر پہنچے تو عورت وہاں موجود تھی۔ انھوں نے اس سے خط مانگا۔ اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ انھوں نے تلاشی لی۔ مگر کوئی خط نہ ملا۔ آخر کو انہوں نے کہا خط ہمارے حوالے کر ورنہ ہم برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اپنی چوٹی میں سے وہ خط نکال کر انہیں دے دیا اور یہ اسے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں قریش کے لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ (مختلف روایات میں خط کے الفاظ مختلف نقل ہوئے ہیں، مگر مدعا سب کا یہی ہے)۔ حضورؐ نے حضرت حاطب سے پوچھا، یہ کیا حرکت ہے۔ انہوں نے عرض کیا آپ میرے معاملہ میں جلدی نہ فرمائیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس بنا پر نہیں کیا ہے کہ میں کافر و مرتد ہو گیا ہوں اور اسلام کے بعد اب کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اقرباء مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے اپنے قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا تھا۔ مہاجرین میں دوسرے جن لوگوں کے اہل و عیال مکہ میں ہیں ان کو تو ان کا قبیلہ بچا لے گا۔ مگر میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جسے کوئی بچانے والا ہو۔ اس لیے میں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش والوں پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر کے وہ میرے بال بچوں کو نہ چھیڑیں۔ (حضرت حاطب کے بیٹے عبدالرحمٰن کی روایت یہ ہے کہ اس وقت حضرت حاطب کے بچے اور بھائی مکہ میں تھے۔ اور خود حضرت حاطب کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ماں بھی وہیں تھیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب کی یہ بات سُن کر حاضرین سے فرمایا قَدْ صدقکم، "حاطب نے تم سے سچی بات کہی ہے"۔ یعنی ان کے اس فعل کا اصل محرک یہی تھا، اسلام سے انحراف اور کفر کی حمایت کا جذبہ اس کا محرک نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اُٹھ کر عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں، اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "اس شخص نے جنگِ بدر میں حصہ لیا ہے۔ تمھیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تم کو معاف کیا۔" (اس آخری فقرے کے الفاظ مختلف روایات میں مختلف ہیں۔ کسی میں ہے قد غفرت لکم، میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔ کسی میں ہے انی غافر لکم، میں تمہیں بخش دینے والا ہوں۔ اور

(وطن چھوڑ کر گھروں سے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہِ راست سے بھٹک گیا۔ اُن کا رویّہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمہیں آزار دیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ[۳]۔ قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد[۴]۔ اس روز اللہ تمہارے

---

کسی میں ہے ساغفر لکم۔ میں تمہیں بخش دوں گا)۔ یہ بات سُن کر حضرت عمرؓ رو دیے اور انہوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ اُن کثیر التعداد روایات کا خلاصہ ہے جو متعدد معتبر سندوں سے بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن جریر طبری، ابن ہشام، ابن حبان اور ابن ابی حاتم نے نقل کی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مستند روایت وہ ہے جو خود حضرت علیؓ کی زبان سے ان کے کاتب (سکرٹری) عبید اللہ بن ابی رافع نے سنی اور ان سے حضرت علی کے پوتے حسن بن محمد بن حنفیہ نے سن کر بعد کے راویوں تک پہنچائی۔ ان میں سے کسی روایت میں بھی یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حاطب کا یہ عذر سن کر ان کو معاف کر دیا گیا۔ لیکن کسی ذریعہ سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ انہیں کوئی سزا دی گئی۔ اسی لیے عُلماءِ امّت نے یہی سمجھا ہے کہ حضرت حاطب کا عذر قبول کر کے انہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

۲۔ یہاں تک جو کچھ ارشاد ہُوا ہے، اور آگے اسی سلسلے میں جو کچھ آرہا ہے، اگرچہ اس کے نزول کا موقع حضرت حاطب ہی کا واقعہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تنہا انہی کے مقدمہ پر کلام فرمانے کے بجائے تمام اہلِ ایمان کو ہمیشہ کے لیے یہ درس دیا ہے کہ کفر و اسلام کا جہاں مقابلہ ہو اور جہاں کچھ لوگ اہلِ ایمان سے اُن کے مسلمان ہونے کی بنا پر دشمنی کر رہے ہوں، وہاں کسی شخص کا کسی غرض اور کسی مصلحت سے بھی کوئی ایسا کام کرنا جس سے اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہو اور کفر و کفار کے مفاد کی خدمت ہوتی ہو، ایمان کے منافی حرکت ہے۔ کوئی شخص اگر اسلام کی بدخواہی کے جذبہ سے بالکل خالی ہو اور بدنیّتی سے نہیں بلکہ محض اپنی کسی شدید ترین ذاتی مصلحت کی خاطر ہی یہ کام کرے، پھر بھی یہ فعل کسی مومن کے کرنے کا نہیں ہے، اور جس نے بھی یہ کام کیا وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔

درمیان جدائی ڈال دے گا،۴ اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۵۔

۳ یہ اشارہ ہے حضرت حاطب کی طرف۔ انہوں نے اپنی ماں، اپنے بھائی، اور اپنی اولاد کو جنگ کے موقع پر دشمنوں کی ایذا سے بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے جن کی خاطر اتنے بڑے قصور کا ارتکاب کر ڈالا وہ قیامت کے روز تمہیں بچانے کے لیے نہیں آئیں گے۔ کسی کی یہ ہمت نہیں ہوگی کہ خدا کی عدالت میں آگے بڑھ کر یہ کہے کہ ہمارے باپ یا ہمارے بیٹے یا ہمارے بھائی نے ہماری خاطر یہ گناہ کیا تھا اس لیے اس کے بدلے کی سزا ہمیں دے دی جائے۔ اُس وقت ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوگی، اپنے اعمال ہی کے خمیازے سے بچنے کا سوال ہر شخص کے لیے بلائے جان بن رہا ہوگا، کجا کہ کوئی کسی دوسرے کے حصے کا خمیازہ بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار ہو۔ یہی بات ہے جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر زیادہ صریح الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا "اس روز مجرم یہ چاہے گا کہ اپنی اولاد، اپنی بیوی، اپنے بھائی، اپنی حمایت کرنے والے خاندان اور دنیا بھر کے لوگوں کو بھی اگر فدیے میں دے کر عذاب سے چھوٹ سکتا ہو تو انہیں بھینٹ چڑھا دے اور خود چھوٹ جائے" (المعارج، آیات ۱۱-۱۴)۔ دوسری جگہ فرمایا "اس روز آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ہر ایک اپنے ہی حال میں ایسا گرفتار ہوگا جس میں اسے کسی کا ہوش نہ ہوگا" (عبس، ۳۴-۳۷)

۴ یعنی دنیا کے تمام رشتے، تعلقات، اور رابطے وہاں توڑ دیے جائیں گے۔ جتھوں اور پارٹیوں اور خاندانوں کی شکل میں لوگوں کا محاسبہ نہ ہوگا، بلکہ ایک ایک فرد اپنی ذاتی حیثیت میں پیش ہوگا اور ہر ایک کو اپنا ہی حساب دینا پڑے گا۔ اس لیے دنیا میں کسی شخص کو بھی کسی قرابت یا دوستی یا جتھہ بندی کی خاطر کوئی ناجائز کام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اپنے اس کام کی سزا اُس کو خود ہی بھگتنی ہوگی، اس کی ذاتی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا۔

۵ حضرت حاطب کے اس مقدمہ سے جس کی تفصیل اوپر ہم نے نقل کی ہے، اور ان آیات سے جو اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(۱) قطع نظر اس سے کہ کرنے والے نے کس نیت سے کیا، بجائے خود یہ فعل صریحاً ایک جاسوسی کا فعل تھا، اور جاسوسی بھی بڑے نازک موقع پر سخت خطرناک نوعیت کی تھی کہ حملے سے پہلے بے خبر دشمن کو خبردار کیا گیا تھا۔ پھر معاملہ شبہ کا بھی نہ تھا بلکہ ملزم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط پکڑ لیا گیا تھا جس کے بعد کسی ثبوت کی حاجت نہ تھی۔

حالات بھی زمانہ امن کے نہیں، زمانہ جنگ کے تھے۔ مگر اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب کو صفائی کا موقع دیئے بغیر نظر بند نہیں کر دیا۔ اور صفائی کا موقع بھی ان کو بند کرنے میں نہیں بلکہ کھلی عدالت میں بر سرِ عام دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایسے قوانین اور قواعد و ضوابط کی کوئی گنجائش نہیں ہے جن کی رو سے کسی حالت میں حکام کو یہ حق پہنچتا ہو کہ کسی شخص کو محض اپنے علم یا شبہ کی بنا پر قید کر دیں۔ اور بند کرنے میں خفیہ طریقے پر مقدمہ چلانے کا طریقہ بھی اسلام میں نہیں ہے

(۲) حضرت حاطب نہ صرف مہاجرین میں سے تھے بلکہ اہلِ بدر میں شامل تھے جنہیں صحابہ کے اندر بھی ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ مگر اس کے باوجود ان سے اتنا بڑا جرم سرزد ہو گیا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس شدت کے ساتھ گرفت فرمائی جسے اوپر کی آیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ احادیث میں بھی ان کا قصہ پوری تفصیل کے ساتھ نقل کیا گیا اور مفسرین میں سے بھی شاید ہی کوئی ہو جس نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ یہ من جملہ ان بہت سے شواہد کے ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ بے خطا نہیں تھے، اُن سے بھی بشری کمزوریوں کی بنا پر خطائیں سرزد ہو سکتی تھیں اور عملاً ہوئیں، اور اُن کے احترام کی جو تعلیم اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے کم از کم اُس کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی سے اگر کوئی غلط کام سرزد ہوا ہو تو اس کا ذکر نہ کیا جائے، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس کا تقاضا یہ ہوتا تو نہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ان کا ذکر کرتا اور نہ صحابہ کرام اور تابعین اور محدثین و مفسرین اپنی روایات میں ان کی تفصیلات بیان کرتے۔

(۳) حضرت حاطب کے مقدمہ میں حضرت عمرؓ نے جس رائے کا اظہار کیا وہ ان کے فعل کی ظاہری صورت کے لحاظ سے تھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ فعل ایسا ہے جو صریحاً اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی نوعیت رکھتا ہے، اس لیے حاطب منافق اور واجب القتل ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس نقطۂ نظر کو رد فرما دیا اور اسلامی شریعت کا اصل نقطۂ نظر یہ بتایا کہ محض فعل کی ظاہری شکل پر ہی فیصلہ نہیں کر دینا چاہیے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس شخص سے وہ صادر ہوا ہے اس کی پچھلی زندگی اور مجموعی سیرت کیا شہادت دیتی ہے اور قرائن کس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ فعل کی شکل بلا شبہ جاسوسی کی ہے۔ مگر کیا اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ فاعل کا آج تک کا رویہ یہی بتا رہا ہے کہ یہ شخص یہ کام اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے ساتھ

خیانت کی نیت سے کر سکتا تھا؟ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے ایمان کی خاطر ہجرت کی۔ کیا خلوص کے بغیر وہ اتنی بڑی قربانی کر سکتا تھا؟ اس نے جنگ بدر جیسے نازک موقع پر، جبکہ دشمنوں کی تین گنی اور بہت زیادہ مسلح طاقت سے مقابلہ درپیش تھا، ایمان کی خاطر اپنی جان لڑائی۔ کیا ایسے آدمی کا اخلاص مشتبہ ہو سکتا ہے؟ یا اس کے بارے میں یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں کفار قریش کی طرف کوئی ادنیٰ سا میلان بھی موجود ہے؟ وہ اپنے فعل کی صاف صاف وجہ یہ بتا رہا ہے کہ مکہ میں اس کے بال بچوں کو خاندان اور قبیلے کا وہ تحفظ حاصل نہیں ہے جو دوسرے مہاجرین کو حاصل ہے، اس لیے اس نے ان کو جنگ کے موقع پر کفار کی ایذا رسانی سے بچانے کی خاطر یہ کام کیا۔ حقائق اس کی تائید کرتے ہیں کہ فی الواقع مکہ میں اس کا کوئی قبیلہ نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ واقعی اس کے بال بچے وہاں موجود ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے اس بیان کو جھوٹا سمجھا جائے اور یہ رائے قائم کی جائے کہ اس فعل کا اصل محرک یہ نہ تھا بلکہ خیانت ہی کا ارادہ اس کے اندر پایا جاتا تھا۔ بلاشبہ ایک مخلص مسلمان کے لیے نیک نیتی سے بھی یہ حرکت جائز نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دشمنوں کو مسلمانوں کے جنگی منصوبوں کی خبر بہم پہنچائے، لیکن مخلص کی غلطی اور منافق کی غداری میں بڑا فرق ہے۔ محض نوعیتِ فعل کی بنا پر دونوں کی ایک ہی سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ تھا اس مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ، اور اللہ تعالیٰ نے سورہ ممتحنہ کی ان آیات میں اس کی تائید فرمائی۔ اُوپر کی تینوں آیات کو غور سے پڑھیے تو صاف محسوس ہو گا کہ ان میں حضرت حاطب پر عتاب تو ضرور فرمایا گیا ہے، مگر یہ عتاب اُس طرز کا ہے جو ایک مومن کے لیے ہوتا ہے نہ کہ وہ جو ایک منافق کے لیے ہوا کرتا ہے۔ مزید برآں ان کے لیے کوئی مالی یا جسمانی سزا تجویز نہیں کی گئی ہے بلکہ علانیہ سخت زجر و توبیخ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم معاشرے میں ایک خطاکار مومن کی عزت کو بٹہ لگ جانا اور اس کے اعتماد پر حرف آجانا بھی اس کے لیے ایک بڑی سزا ہے۔

(۴) بدری صحابہ کی فضیلت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "تمہیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تم کو معاف کر دیا"، اس کے معنی یہ نہ تھے کہ بدری صحابیوں کو معاف خون معاف ہیں، اور انہیں کھلی چھٹی ہے کہ دنیا میں جو گناہ اور جو جرم بھی کرنا چاہیں کرتے رہیں، مغفرت کی اُن کو پیشگی ضمانت حاصل ہے۔ یہ مطلب نہ حضور کا تھا، نہ صحابہ نے کبھی اس

ارشاد کا یہ مطلب لیا، نہ کسی بدری صحابی نے یہ بشارت سن کر اپنے آپ کو ہر گناہ کرنے کے لیے آزاد سمجھا، اور نہ اسلامی شریعت میں اس کی بنا پر ایسا کوئی قاعدہ بنایا گیا کہ بدری صحابی سے اگر کوئی جرم سرزد ہو تو اسے کوئی سزا نہ دی جائے۔ دراصل جس موقع و محل میں یہ بات فرمائی گئی تھی اس پر، اور خود ان الفاظ پر جو آپ نے استعمال فرماتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اہلِ بدر نے اللہ اور اس کے دین کے لیے اخلاص اور سرفروشی و جانبازی کا اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہوں تو یہ بھی اس خدمت اور اللہ کے کرم کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید از امکان نہیں ہے، لہٰذا ایک بدری پر خیانت اور منافقت کا شبہ نہ کرو، اور اپنے جرم کا جو سبب وہ خود بیان کر رہا ہے اسے قبول کر لو۔

(۵) قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان کا کفار کے لیے جاسوسی کر بیٹھنا بجائے خود اس بات کا فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ مرتد ہو گیا ہے یا ایمان سے خارج ہے، یا منافق ہے۔ ایسا فیصلہ کرنے کے لیے اگر کچھ دوسرے قرائن و شواہد موجود ہوں تو بات الگ ہے، ورنہ اپنی جگہ یہ فعل صرف ایک جرم ہے، کفر نہیں ہے۔

(۶) قرآن مجید کی ان آیات سے یہ بات بھی واضح ہے کہ مسلمان کے لیے کفار کی جاسوسی کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، خواہ اس کی یا اس کے قریب ترین عزیزوں کی جان و مال کو کیسا ہی خطرہ لاحق ہو۔

(۷) حضرت عمرؓ نے جب حضرت حاطب کو جاسوسی کے جرم میں قتل کرنے کی اجازت طلب کی تو حضورؐ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ یہ جرم مستوجبِ قتل نہیں ہے۔ بلکہ اجازت دینے سے انکار اس بنا پر کیا کہ حاطب کا بدری ہونا ان کے مخلص ہونے کا صریح ثبوت ہے اور ان کا یہ بیان صحیح ہے کہ انہوں نے دشمنوں کی خیر خواہی کے لیے نہیں بلکہ اپنے بال بچوں کو ہلاکت کے خطرے سے بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ اس سے فقہاء کے ایک گروہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کے لیے عام قانون یہی ہے کہ اسے قتل کیا جائے الا یہ کہ بہت وزنی وجوہ اسے کم تر سزا دینے یا محض ملامت کر کے چھوڑ دینے کے لیے موجود ہوں۔ مگر فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان جاسوس کو تعزیر دی جائے گی مگر اس کا قتل جائز نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اسے جسمانی عقوبت اور طویل

تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پُوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا[۷] اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بَیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر

---

قید کی سزا دی جائے گی۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اسے قتل کیا جائے گا۔ لیکن مالکی فقہاء کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہیں۔ اَشہب کہتے ہیں کہ امام کو اس معاملہ میں وسیع اختیارات حاصل ہیں، جرم اور مجرم کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے اجتہاد سے کوئی سزا دے سکتا ہے۔ ایک قول امام مالک اور ابن القاسم کا بھی یہی ہے۔ ابن الماجشُون اور عبدالملک بن حبیب کہتے ہیں کہ اگر مجرم نے جاسوسی کی عادت ہی بنالی ہو تو اسے قتل کیا جائے۔ ابن وَہب کہتے ہیں کہ جاسوس کی سزا تو قتل ہی ہے مگر وہ اس فعل سے تائب ہو جائے تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ سَحنُون کہتے ہیں کہ اس کی توبہ صحیح ہے یا محض فریب، اس کا علم آخر کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے قتل ہی کیا جانا چاہیے۔ ابن القاسم کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ اور اَصبَغ کہتے ہیں کہ حربی جاسُوس کی سزا قتل ہے، مگر مسلم اور ذمی جاسوس کو قتل کے بجائے عقوبت دی جائے گی، الّا یہ کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں دشمنوں کی کھلی کھلی مدد کر رہا ہو۔ (احکام القرآن، ابن العربی۔ عمدۃ القاری۔ فتح الباری)۔

(۸) حدیثِ مذکور سے اس امر کا جواز بھی نکلتا ہے کہ تفتیشِ جرم کے لیے اگر ضرورت پڑے تو ملزم مرد ہی نہیں، عورت کے کپڑے بھی اُتارے جا سکتے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ نے اگرچہ اس عورت کو برہنہ نہیں کیا تھا، لیکن انہوں نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ خط حوالے نہ کرے گی تو وہ اسے برہنہ کر کے اس کی تلاشی لیں گے۔ ظاہر ہے اگر یہ فعل جائز نہ ہوتا تو یہ تین جلیل القدر صحابی اس کی دھمکی نہیں دے سکتے تھے۔ اور قیاس یہ کہتا ہے کہ انہوں نے ضرور واپس جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مہم کی رُوداد سنائی ہو گی۔ حضورؐ نے اگر اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہوتا تو وہ ضرور منقول ہوتا۔ اسی لیے فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے (عمدۃ القاری)۔

[۷] یعنی ہم تمہارے کافر ہیں، نہ تمہیں حق پر مانتے ہیں نہ تمہارے دین کو۔ اللہ پر ایمان کا لازمی تقاضا طاغوت سے کفر ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ "پس جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے درحقیقت مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے

ایمان نہ لاؤ"۔ مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا (اس سے مستثنیٰ ہے)، کہ "میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا، اور میرے بس میں کچھ نہیں کہ اللہ سے آپ کو معافی دلوا بھی دوں" (اور ابراہیم و

والا نہیں ہے" (البقرہ ۲: ۲۵۶)۔

ؔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے حضرت ابراہیم کی یہ بات تو قابلِ تقلید ہے کہ انہوں نے اپنی کافر و مشرک قوم سے صاف صاف بیزاری اور قطع تعلق کا اعلان کر دیا، مگر ان کی یہ بات تقلید کے قابل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے مشرک باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا وعدہ کیا اور عملاً اس کے حق میں دعا کی۔ اس لیے کہ کافروں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا اتنا تعلق بھی اہلِ ایمان کو نہ رکھنا چاہیے۔ سورۂ توبہ (آیت ۱۱۳) میں اللہ تعالیٰ کا صاف صاف ارشاد ہے مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ "نبی کا یہ کام نہیں ہے اور نہ اُن لوگوں کو یہ زیبا ہے جو ایمان لاتے ہیں کہ مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت کریں، خواہ وہ اُن کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں"۔ پس کوئی مسلمان اس دلیل سے اپنے کافر عزیزوں کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کا مجاز نہیں ہے کہ یہ کام حضرت ابراہیم نے کیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ خود حضرت ابراہیمؑ نے یہ کام کیسے کیا، اور کیا وہ اس پر قائم بھی رہے، اس کا جواب قرآن مجید میں ہم کو پوری تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ ان کے باپ نے جب ان کو گھر سے نکال دیا تو چلتے وقت انہوں نے کہا تھا سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي "آپ کو سلام ہے، میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا" (مریم: ۴۷)۔ اسی وعدے کی بنا پر انہوں نے دو مرتبہ اس کے حق میں دعا کی۔ ایک دعا کا ذکر سورۂ ابراہیم (آیت ۴۱) میں ہے: رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ "اے ہمارے پروردگار، مجھے اور میرے والدین کو اور سب مومنوں کو اس روز معاف کر دیجیو جب حساب لیا جانا ہے"۔ اور دوسری دعا سورۂ شعراء (آیت ۸۶) میں ہے: وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ "میرے باپ کو معاف فرما دے کہ وہ گمراہوں میں سے تھا اور مجھے اُس دن رُسوا نہ کر جب سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے"۔ لیکن بعد میں جب اُن کو یہ احساس ہو گیا کہ اپنے جس باپ کی مغفرت کے لیے وہ دعا کر رہے ہیں وہ تو اللہ کا دشمن تھا، تو انہوں نے اس سے تبری کی اور اس کے ساتھ ہمدردی و محبت کا یہ تعلق بھی توڑ لیا:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ، اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (التوبہ - ۱۱۴)

اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنا اِن کے سِوا کسی وجہ سے نہ تھا کہ ایک وعدہ تھا جو اس نے اپنے باپ سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن تھا تو اس نے اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم ایک رقیق القلب اور نرم خو آدمی تھا۔

اِن آیات پر غور کرنے سے یہ اصولی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء کا صرف وہی عمل قابلِ تقلید ہے جس پر وہ آخر وقت تک قائم رہے ہوں۔ رہے ان کے وہ اعمال جن کو انہوں نے بعد میں خود چھوڑ دیا ہو، یا جن پر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں قائم نہ رہنے دیا ہو، یا جن کی ممانعت اللہ کی شریعت میں وارد ہو چکی ہو، وہ قابلِ تقلید نہیں ہیں اور کوئی شخص اس حجت سے ان کے ایسے اعمال کی پیروی نہیں کر سکتا کہ یہ فلاں نبی کا عمل ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے جو آدمی کے ذہن میں کھٹک پیدا کر سکتا ہے۔ آیت زیرِ بحث میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے جس قول کو قابلِ تقلید نمونہ ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا "میں آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا"۔ اور دوسرا حصہ یہ کہ "میرے بس میں کچھ نہیں ہے کہ اللہ سے آپ کو معافی دلوا دوں"۔ ان میں سے پہلی بات کا قابلِ تقلید نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر دوسری بات میں کیا خرابی ہے کہ اسے بھی نمونۂ قابلِ تقلید ہونے سے مستثنیٰ کر دیا گیا؟ حالانکہ وہ بجائے خود حق بات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول استثناء میں اس وجہ سے داخل ہوا ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے ایک کام کا وعدہ کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ اس سے زیادہ تیرے لیے کچھ کرنا میرے بس میں نہیں ہے تو اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کے بس میں ہوتا تو وہ شخص اس کی خاطر وہ بھی کرتا۔ یہ بات اُس آدمی کے ساتھ اس شخص کے ہمدردانہ تعلق کو اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کا یہ دوسرا قول بھی استثناء میں شامل کیے جانے کا مستحق تھا اگرچہ اس کا یہ مضمون بجائے خود برحق تھا کہ اللہ سے کسی کی مغفرت کروا دینا ایک نبی تک کے اختیار سے باہر ہے۔ علامہ آلوسی

اصحاب ابراہیمؑ کی وہ دعا نقل کرکے ؟ "اے ہمارے رب، تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسا کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کرلیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب، ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے^شے اور اے ہمارے رب، ہمارے قصوروں سے درگزر فرما، بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے۔"

اِنہی لوگوں کے طرزِ عمل میں تمہارے لیے اور ہر اُس شخص کے لیے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ آخر کا امیدوار ہو۔^۹ اِس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے^نلہ ع

ع ا

---

نے بھی روح المعانی میں اس سوال کا یہی جواب دیا ہے۔

شہ کافروں کے لیے اہلِ ایمان کے فتنہ بننے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں جن سے ہر مومن کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کافر اُن پر غالب آجائیں اور اپنے غلبہ کو اس بات کی دلیل قرار دیں کہ ہم حق پر ہیں اور اہل ایمان برسرِ باطل، ورنہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اِن لوگوں کو خدا کی رضا حاصل ہوتی اور پھر بھی ہمیں ان پر غلبہ حاصل ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اہلِ ایمان پر کافروں کا ظلم و ستم اُن کی حدِ برداشت سے بڑھ جائے اور آخر کار وہ ان سے دب کر اپنے دین و اخلاق کا سودا کرنے پر اُتر آئیں۔ یہ چیز دنیا بھر میں مومنوں کی جگ ہنسائی کی موجب ہوگی اور کافروں کو اس سے دین اور اہلِ دین کی تذلیل کا موقع ملے گا۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دینِ حق کی نمائندگی کے مقامِ بلند پر فائز ہونے کے باوجود اہلِ ایمان اُس اخلاقی فضیلت سے محروم رہیں جو اِس مقام کے شایانِ شان ہے، اور دنیا کو اُن کی سیرت و کردار میں بھی وہی عیوب نظر آئیں جو جاہلیت کے معاشرے میں عام طور پر پھیلے ہوتے ہوں۔ اس سے کافروں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ اس دین میں آخر وہ کیا خوبی ہے جو اسے ہمارے کفر پر شرف عطا کرتی ہو؟ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۸۳)

شہ یعنی جو اس بات کی توقع رکھتا ہو کہ ایک روز اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، اور اس چیز کا امیدوار ہو کہ اللہ اسے اپنے فضل سے نوازے اور روزِ آخر میں اسے سُرخروئی نصیب ہو۔

نلہ یعنی اللہ کو ایسے ایمان لانے والوں کی کوئی حاجت نہیں ہے جو اس کے دین کو ماننے کا دعویٰ بھی کریں اور پھر اس کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھیں۔ وہ بے نیاز ہے: اس کی خدائی اِس کی محتاج نہیں ہے کہ یہ لوگ اسے خدا مانیں۔ اور وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے، اس کا محمود ہونا اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ یہ اس کی حمد

بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمہارے اور اُن لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے[۱۱]۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور وہ غفور و رحیم ہے۔

---

کریں۔ یہ اگر ایمان لاتے ہیں تو اللہ کے کسی فائدے کے لیے نہیں، اپنے فائدے کے لیے لاتے ہیں۔ اور انہیں ایمان کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک یہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی طرح اللہ کے دشمنوں سے محبت اور دوستی کے رشتے توڑ نہ لیں۔

[۱۱] اُوپر کی آیات میں مسلمانوں کو اپنے کافر رشتہ داروں سے قطع تعلق کی جو تلقین کی گئی تھی اس پر سچے اہلِ ایمان اگرچہ بڑے صبر کے ساتھ عمل کر رہے تھے، مگر اللہ کو معلوم تھا کہ اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں اور قریب ترین عزیزوں سے تعلق توڑ لینا کیسا سخت کام ہے اور اس سے اہلِ ایمان کے دلوں پر کیا کچھ گزر رہی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی کہ وہ وقت دُور نہیں ہے جب تمہارے یہی رشتہ دار مسلمان ہو جائیں گے اور آج کی دشمنی کل پھر محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ جب یہ بات فرمائی گئی تھی اس وقت کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ نتیجہ کیسے رونما ہو گا۔ مگر ان آیات کے نزول پر چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ مکہ فتح ہو گیا، قریش کے لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے اور مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جس چیز کی انہیں امید دلائی گئی تھی وہ کیسے پوری ہوئی۔

# ترکی میں دینی بیداری

## خلیل حامدی

اب سے چند سال پہلے عدنان مینڈریس مرحوم کے دورِ حکومت میں جب ترکیہ کے اندر لادینی سے دین کی طرف رجوع کا آغاز ہوا تھا۔ اُس وقت امریکہ، برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئی تھیں، اور یہ گھنٹیاں بجانے والے زیادہ تر یہودی نامہ نگار تھے۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ اب پھر ترکوں کے اندر اسلام کی طرف بڑھتا ہوا رجوع دیکھ کر مغربی اخبارات نے وہی خطرے کی گھنٹیاں بجانی شروع کر دی ہیں۔ ذیل میں ہم برطانیہ کے مشہور اخبار گارڈین کے ایک مضمون کا ترجمہ دے رہے ہیں جو اس کی ۲۷ راپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں درج ہوا ہے۔ مضمون کا لکھنے والا ایک مشہور یہودی سام کوہن ہے اور وہ ترکیہ ہی میں مقیم ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ترکی نے چالیس سال پیشتر سیکولرازم قبول کیا تھا اور اب تک اُس پر عمل پیرا رہا ہے۔ لیکن نصف صدی مکمل نہیں ہونے پائی کہ اب دوبارہ ترکی کے اندر قدامت پرستی کی رَو اُٹھ کھڑی ہوئی ہے اور ملک کے مختلف حصّوں میں اس کی پیش قدمی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ترکی کے ترقی پسند حلقے اس روز افزوں رَو پر گہرے اور شدید قلق اور تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ کمال اتاترک نے چالیس سال پیشتر ترکی معاشرے کی جو تشکیل کی تھی یہ رَو اُس معاشرے کی عصری بنیادوں کے لیے شدید خطرے کا پیغام ہے۔

جہاں تک سلیمان دیمریل کی کنزرویٹو حکومت اور حکمراں پارٹی حزبِ عدالت کا تعلق ہے، یہ دونوں اس خطرے کے وجود سے انکار کر رہے ہیں۔ سرکاری نقطۂ نظر کی بنیاد یہ ہے کہ اتاترک کی اصلاحات پر ملک کے اندر جگہ جگہ جو حملے ہو رہے ہیں ان سے نمٹنے کے لیے ملکی عدالتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ باقی رہی مذہبی مراسم کی ادائیگی تو اس پر کسی نوعیت کی پابندی لگانا درست نہیں ہے۔

ترکی میں جس روز سے "مذہبی حکومت" کی بساط لپٹی ہے اُس روز سے مذہبی آزادی کا مسئلہ ایک بحث تنازع فیہ مسئلہ بنا رہا ہے ۔ آتا ترک کے عہد اور اس کے بعد یک جماعتی نظام کے دَور میں اسلامی تعصب (FANATICISM) کو کسی ذریعہ سے بھی سر اٹھانے کی اجازت نہیں تھی ۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد جب سے پارلیمانی جمہوریت کا نظام ملک کے اندر داخل کیا گیا، رجعت پسند عناصر نے پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے اور وہ برابر اُبھرتے چلے گئے[1]۔ عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مذہبی جنون پر سے دباؤ کم کر دیا، اور دیہاتی آبادیوں اور قدامت پسند عوام سے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر مذہبیت کو کھلی چھٹی دے دی[2]۔ ۱۹۶۰ء میں ترکی کے اندر فوجی انقلاب رُونما ہوا[3] اور ڈیموکریٹک حکومت اور اُس کے سربراہ عدنان مندریس کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ انقلاب کے ایک سال بعد عدنان مندریس کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ۔ اور آج پھر حکمران پارٹی حزبِ عدالت کو موردِ الزام ٹھیرایا جا رہا ہے کہ وہ بھی ڈیموکریٹک پارٹی کی ڈگر پر چل رہی ہے ۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حزبِ عدالت ڈیموکریٹک پارٹی کی قدرتی وارث اور جانشین سمجھی جاتی ہے ۔

---

[1] یہ ہے مسلمان ممالک کے بارے میں اہلِ مغرب کا نقطۂ نظر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان ملکوں میں اسلام کو دبانے اور مٹانے کے لیے ڈکٹیٹر شپ اور یک جماعتی نظام ہی موزوں ہے ۔ پارلیمانی جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ مختلف پارٹیاں ملک میں کام کریں اور جو لوگ بھی عوام کے ووٹ زیادہ تعداد میں حاصل کریں ان ہی کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار ہو ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان عوام سے کوئی ایسی پارٹی ووٹ حاصل نہ کر سکے گی جو اسلام کی مخالف ہو ۔

[2] دوسرے الفاظ میں یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ یک جماعتی نظام کے دور میں ترکی کے مسلم عوام کی مرضی کے خلاف کام کیا جا رہا تھا ۔ اور جب دوسری جماعت ملک میں قائم ہوئی تو انتخابات میں اس کو صرف اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ اس نے ملک کے مسلم عوام کی مرضی کے مطابق کام کرنے کا وعدہ کیا ۔ دشمنانِ اسلام کو یہی جمہوریت ناگوار ہے ۔

[3] یہ اعتراف کرتے ہوئے شاید ان لوگوں کو شرم آتی ہے کہ فوجی انقلاب خود نہیں ہُوا بلکہ کرایا گیا ، اور انقلاب کرانے والے یہ لوگ خود تھے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکی میں اسلام کے احیائے نو کے علمبرداروں کے حوصلے بڑھنے کا ظاہری سبب موجودہ حکومت کا روادارانہ (یعنی جمہوریت پسندانہ!) رویہ ہے۔ ان دنوں اکثر و بیشتر مسجدوں میں ائمہ اور خطباء علانیہ اپنی تقریروں میں اتاترک کی اصلاحات کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ بلکہ کئی لوگوں نے واشگاف الفاظ میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے۔ بعض خطیبوں نے ـــــ جو منی اسکرٹ کے خلاف غیظ و غضب سے بھرپور تھے ـــــ عورتوں کو اکسایا کہ وہ آبرومندانہ روش اختیار کریں اور اپنے جسموں اور سروں کو ڈھانک کر نکلیں۔ اتاترک کی تصویروں اور مجسموں کے خلاف بھی کئی واقعات پیش آچکے ہیں۔ یہ تصویریں اور مجسمے ملک میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ پچھلے چند ماہ سے ترکی میں رجعت پسندانہ (یعنی اسلام کے حامی!) اخبارات اور رسائل اچانک اور بکثرت منظرِ عام پر آرہے ہیں[1]۔ اور ان میں سے بعض کھلم کھلا مذہبی حکومت کی بحالی کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف متعدد ایسی تنظیمیں جو مذہبیت کے اندر غرق ہیں برسرِعمل آگئی ہیں اور انہوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کردی ہیں۔ یہ تنظیمیں ایسا لٹریچر تقسیم کر رہی ہیں جس میں موجودہ دستور کو بدلنے اور نظامِ خلافت کو زندہ کرنے اور اس نوعیت کی دوسری چیزوں کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ان تنظیموں کی رہنمائی اور تقویت کا مرکز اخوان المسلمون کی جماعت اور ہمسایہ عرب ممالک کی اسلامی تنظیمیں ہیں۔ اگر آپ بستیوں میں جائیں تو دیکھیں گے کہ مسلمان معلّمین (جنہیں ترک "خوجہ" کہتے ہیں) بڑی سرگرمی کے ساتھ سیکولر اسکولوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور "اسلامی اسکول" قائم کرتے چلے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی مشکل یہ ہے کہ بستیوں اور چھوٹی چھوٹی دیہی آبادیوں کے اندر حکومت کے سیکولر اسکولوں کی تعداد ناکافی ہے جس کی وجہ سے مذہبی دیوانوں کو کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

حال ہی میں ایک نیا واقعہ پیش آیا ہے۔ انقرہ میں شریعت کالج کے طلبہ نے اس بنا پر احتجاجی ہڑتال کردی کہ کالج کی ایک طالبہ کو لیکچر روم سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ اُس نے سر کو اوڑھنی سے ڈھانکنے پر اصرار کیا تھا۔ اس

---

[1] اللہ کا شکر ہے کہ ترکی میں اب متعدد اسلامی اخبارات وجود میں آگئے ہیں جو اپنے معیار کے لحاظ سے لادینی اخبارات سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ روزنامہ "اتحاد" اور "بگن" ان میں سرفہرست ہیں۔ اب وہ وقت گیا جب صرف احمد یلمان کا "وطن" اخبار ترکی کا واحد ترجمان سمجھا جاتا تھا۔

واقعہ پر تمام طلبہ نے نہ صرف ہڑتال کر دی بلکہ ڈین سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا اور اُسے طلبہ کا دشمن قرار دیا۔ ترکی اخبارات میں اس قضیہ پر مفصل بحث ہو چکی ہے اور اب یہ معاملہ پارلیمنٹ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حزب عدالت کے بعض نمائندوں نے پارلیمنٹ کو اس قضیہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ اس طالبہ کی حمایت کر رہے ہیں[۱]

بعض تنظیموں نے جو اپنے آپ کو "وطن پسند" اور "کنزرویٹو" کے اسماء سے متعارف کرا رہی ہیں، عوامی مظاہرات بھی کرنے شروع کر دیے ہیں۔ ان مظاہرات کا مقصد بظاہر ملک کے اندر کمیونزم اور بائیں بازو کی روز افزوں سرگرمیوں کے خلاف احتجاج ہے تازہ واقعہ ہے کہ انقرہ اور استنبول میں وسیع پیمانے پر یہ مظاہرے ہوئے ہیں۔ مظاہرین نے سبز رنگ کے جھنڈے اور پلے کارڈ ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے، کیونکہ سبز رنگ کو اسلام پسندی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جو نعرے لگائے تھے اُن کا مفہوم یہ تھا کہ "ترکی کے اندر اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا"۔ ان مظاہروں میں کمیونزم سے زیادہ سیکولرازم اور ماڈرن ازم کے خلاف جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہے۔[۲]

مزید برآں ماہ اپریل ۱۹۶۸ء کے اوائل میں بورصہ شہر میں دائیں بازو کی مختلف تنظیموں نے ایک عظیم

---

[۱] ترکی اخبار روزنامہ "اتحاد" کے ذریعہ سے اس واقعہ کی جو تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انقرہ یونیورسٹی کے شریعت کالج کی ایک طالبہ جس کا نام عائشہ ہے عام رواج کے برعکس اپنا سر پوری طرح ڈھانکے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے اسے دیکھ کر کہا کہ "مغز کو کھول کر رکھو اور یہ پردہ اتار دو"۔ اس طنز کے جواب میں عائشہ نے جواب دیا کہ میرا سر صرف وہی ننگا کر سکے گا جو میری میت کو غسل دے گا اس سے پہلے یہ سر ہرگز ننگا نہ ہو گا۔ عائشہ کے اس جواب سے پروفیسر صاحب بہت برافروختہ ہوئے اور انہوں نے اُسے لیکچر روم سے اسی وقت نکال دیا۔ طلبہ نے اس پر سخت ناراضی کا اظہار کیا، مگر جب یہ قصہ پرنسپل صاحب تک پہنچا تو انہوں نے بھی پروفیسر صاحب کے موقف کی تائید کی۔ اس کے بعد طلبہ نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ کئی روز تک یہ واقعہ ترکی کے اخبارات میں شہ سرخیوں سے چھپتا رہا۔

[۲] مقالہ نگار نے اس "مذہبیت" کا ایک اہم پہلو ترک کر دیا ہے اور اگر اُس کا بھی ذکر کر دیا جاتا تو اُس کی بات مکمل ہو جاتی۔ وہ پہلو یہ ہے کہ ہر سال ترکی کے حاجیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پانچ سال سے ترکی حاجی تمام دنیا کے حاجیوں سے تعداد میں سبقت لے جا رہے ہیں اور مذہب کا نیا ولولہ اور نئی تڑپ لے کر واپس جا رہے ہیں۔

مشترکہ کانفرنس منعقد کی ہے جس میں اتاترک کی اصلاحات اور سن ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ مقررین نے کانفرنس میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ نہ صرف اسکولوں اور ادب و آرٹ کو بلکہ تھیٹر اور سینما کو بھی اسلام کے رنگ میں رنگا جائے۔ انہوں نے ترکی زبان کے احیاء و تجدید کی بھی مخالفت کی اور یہ اصرار مطالبہ کیا کہ "مجلس علمی برائے ترقی ترکی زبان" کو توڑ دیا جائے۔ مجلس علمی کے قیام کا مقصد ترکی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کرنا ہے۔ اس کانفرنس میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ حکومت اتوار کے بجائے جمعہ کو پھر سے چھٹی کا دن قرار دے[1]۔

اس نئی "مذہبی مہم" میں "وطن پسند" اور کنزرویٹو تنظیمیں سیاست کے میدان میں بھی دخل اندازی کر رہی ہیں[2]۔ روایت پرست لوگ اور مساجد کے ائمہ اور خطباء کا معاندانہ رویہ صرف بائیں بازو کی مخالفت تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے ملک کی سب سے بڑی اپوزیشن طاقت ری پبلکن پارٹی کو بھی اپنی مخالفت کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ یہ وہی پارٹی ہے جس کی داغ بیل اتاترک نے ڈالی تھی اور جسے خالصتہً بائیں بازو کی طاقت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے معتدل بایاں بازو کہنا مناسب ہے۔ جوں جوں ایوان بالا کے ضمنی انتخابات قریب آ رہے ہیں یہ مہم زور پکڑتی جا رہی ہے۔ ان انتخابات کے لیے ۲ جون ۱۹۶۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ ری پبلکن پارٹی کے قائد عصمت انونو بصراحت کر چکے ہیں کہ "یہ مہم اہلِ وطن کے درمیان تند و تیز عداوت پر منتج ہو گی۔ لہٰذا ملک کے تمام ترقی پسند عناصر کے لیے اب لادینی بنیادوں کو بچانا جن پر جمہوریہ ترکیہ کی عمارت قائم ہے انتہائی ناگزیر ہو گیا ہے۔" جدید مذہبی بیداری یا مذہبی لہر کے متوقع نتائج سے اکثر ترک قلق و خوف کا اظہار کر رہے ہیں[3]، اور بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہے

---

[1] مصطفیٰ کمال کی نام نہاد "اصلاحات" میں سے یہ بھی ایک "اصلاح" تھی کہ جمعہ کی چھٹی منسوخ کر کے اتوار کی چھٹی مقرر کی گئی تھی۔ گویا اس شخص کے نزدیک ترکی میں اکثریت مسلمانوں کی نہیں تھی جنہیں جمعہ کے روز نماز کے لیے مسجدوں میں جانا ہوتا ہے بلکہ عیسائیوں کی تھی جنہیں اتوار کے روز چرچ جانا ہوتا ہے۔

[2] یعنی اس یہودی مسخرے کو تو ترکی کی سیاست میں دخل دینے کا حق ہے مگر ترکی کے ۹۸ فی صد مسلمانوں کو اپنے ملک کی سیاست میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

[3] یہ "اکثر ترک" کا لفظ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک بے دین ترک ہی اصل ترک ہیں خواہ ان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی صد بھی نہ ہو۔

ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ ہے کہ یہ لہر قوم کی صفوں میں پھوٹ اور افتراق کے گہرے بیج ڈال دے گی اور نہ صرف ملک کا امن وامان بھسم کر کے رکھ دے گی بلکہ پارلیمانی جمہوریت کا نظام بھی نلپٹ ہو جائے گا۔[1]"

یہ ہے وہ مقالہ جو برطانیہ کے اخبار میں اُس کے یہودی نامہ نگار کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں اس تبصرے کو بھی نقل کر دیں جو اس پر سعودی عرب کے اخبار "المدینہ" نے اپنی ۵ مئی کی اشاعت میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد چند باتیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مقالہ نگار کو اس امر کا شدید قلق اور اندیشہ ہے کہ ترکی میں اب لادینیت کا جنازہ اٹھنے والا ہے۔ اس مضمون میں ترکی کے جدید اسلامی رجحانات کی تصویرکشی اس انداز سے کی گئی ہے کہ گویا ترکی ایک "خوفناک بھوت" کے جنگل میں جا رہا ہے جو مقالہ نگار کے محبوب نظریہ لادینیت کو نگل لینا چاہتا ہے۔ مقالہ نگار کے اس قلق اور اندیشہ کے متعدد تاریخی اسباب ہیں۔

ترکی نے صدیوں تک الحاد اور صلیب پرستی کے حملوں سے عالم اسلامی کو بچائے رکھا ہے۔ یورپ کی طرف سے شرقِ اوسط پر تسلط قائم کرنے کے لیے جتنے منصوبے بنائے گئے ترکی کے بہادرانہ موقف نے انہیں ہر بار ناکام کیا اور تاریخ کی صاف شہادت موجود ہے کہ یورپی استعمار کو عالم اسلامی میں داخل ہونے کا صرف اس وقت موقع ملا ہے جب ترکی ضعف کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے استعمار نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ترکی کے اندر اسلامی رنگ کو ہر پہلو سے محو کرنے کی کوشش کی۔[2]

مگر اب مقالہ نگار کے خوف اور سراسیمگی سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ چالیس سال سے ترکی کو زبردستی سیکولر معاشرے کی گود میں پروان چڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی وہاں اب نوجوان ترکوں کے اندر ایسا

---

[1] ان الفاظ سے دنیا کو یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اب ہم پھر ترکی میں انقلاب کرانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

[2] یہ درحقیقت ایک بڑی خوشگوار تبدیلی ہے جو اب عالم عرب میں ترکی کے متعلق رونما ہو رہی ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے دور میں برطانیہ کی سازشوں کے زیر اثر عربوں اور ترکوں کے درمیان نفرت وعداوت کی جو دیوار حائل کر دی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ ٹوٹ رہی ہے اور عربوں کی رائے عام اب علانیہ یہ تسلیم کر رہی ہے کہ ترکی قوم کو زک پہنچنے کا کتنا بڑا نقصان خود انہیں بھگتنا پڑا ہے۔

عنصر اُبھر رہا ہے جو دین کی طرف پلٹنے کی پرزور دعوت لے کر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ نوجوان جنہوں نے لادینیت کے گہوارہ میں تربیت پائی ہے اور لادینیت کے دودھ سے پلے بڑھے ہیں، لادینیت کی ناکامیوں اور نقصانات کو چشم خود دیکھ اور پرکھ چکے ہیں، اور اُسے رد کر کے دعوتِ حق کے علمبردار بن گئے ہیں۔ مقالہ نگار خوب جانتا ہے کہ اسلام اگر عقیدہ و نظام کی حیثیت سے ترکی میں بحال ہو گیا تو دوسرے لفظوں میں ترکی پھر اُسی ناقابلِ شکست اسلامی قلعہ میں تبدیل ہو جائے گا جس طرح ماضی میں رہ چکا ہے اور یہ قلعہ دشمنانِ اسلام کے تمام منصوبوں اور سازشوں کو حسب سابق پامال کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ یہودی مقالہ نگار ترکی میں مذہب کی اس نئی رو سے نمٹنے کی دعوت دے رہا ہے۔

مقالہ نگار اس خوف و قلق کے بارے میں معذور ہے۔ وہ نسلی اور متعصب یہودی ہے اور وہ اس سے بے خبر نہیں ہے کہ ترکی میں اسلام کا احیائے نو فلسطین میں عربوں کے مغصوبہ حق کو بھی واگزار کرا کے رہے گا اور وہاں سے یہودیوں کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گا۔ اسی لیے مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں بار بار بین السطور اس بات پر اُکسایا ہے کہ اسلامی سیلاب کو جسے وہ قدامت پرستی سے تعبیر کرتا ہے، روکنے کے لیے بند باندھنے کے فوری اور موثر اقدامات کیے جائیں، قبل اس کے کہ یہ بیداری سام کو بہن اور اس کے ساتھی یہودیوں اور ڈونمہ کی مرغوب محبوب "لادینیت" کو بہا کر لے جائے۔ اس غرض کے لیے اُس کا اشارہ ذیل کی کارروائیوں کی طرف ہے:

حزبِ عدالت (جسٹس پارٹی) کو قصرِ حکومت سے نکال دیا جائے کیونکہ یہ کنزرویٹو رجحانات کی علمبردار ہے اور اس نے مذہبی عناصر کے بارے میں "سہل انگاری" سے کام لیا ہے اور اسلام کے سیلاب کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیا ہے۔ حزبِ عدالت سے حکومت چھیننے کے لیے ہر تدبیر اختیار کی جائے، چاہے انتخابات میں دھاندلی کے ذریعہ سے اور چاہے نئے فوجی انقلاب سے۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ عصمت اینونو کی ری پبلکن پارٹی کو ہر قیمت پر برسر اقتدار لایا جائے کیونکہ یہ اتاترک کی پارٹی ہے اور یہی اتاترک پر تنقید کرنے والوں کی خبر لے سکتی ہے۔

وطن پسند اور اصول پرست تنظیموں پر زوردار وار کیا جائے، یہاں تک کہ ان کا نام و نشان باقی نہ رہے اور اگر اس کے بعد ملک کے اندر کمیونزم کو بھی فروغ نصیب ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ

کوہین کی نگاہ میں کمیونزم اسلام کی نسبت کم "خطرناک" اور کم نقصان دہ ہے[1]

وہ تمام رسائل و اخبارات جو اسلام کے داعی ہیں بند کر دیئے جائیں۔ کیونکہ یہ رسائل و اخبارات عوام الناس کو ان کا ماضی یاد دلا رہے ہیں اور ایک مرتبہ جب کہ سیکولرازم ترکی کو اُس کے ماضی سے "آزاد" کرا چکا ہے یہ اخبارات دوبارہ اسی ماضی کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں۔ کوہین نے "ہمسایہ ممالک" کا تو صرف نام ہی لیا ہے ورنہ اُسے معلوم ہے کہ ترکی کے دونوں ہمسایہ ممالک شام اور عراق میں اس وقت "ترقی پسندانہ" حکومتیں قائم ہیں اور ان دونوں ملکوں میں اسلامی تحریک ابتلاء و آزمائش کے مرحلے میں ہے۔ اخوان المسلمون کی طرف بھی مقالہ نگار نے اشارہ کیا ہے، حالانکہ اخوان المسلمون کو کسی جگہ آزادی سے کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ درحقیقت مقالہ نگار کا مقصد ان تمام اسلامی تحریکوں سے ہے جو دنیائے اسلام کے مختلف حصّوں میں پائی جاتی ہیں۔ مقالہ نگار یہ چاہتا ہے کہ تمام اسلامی تحریکوں کی سرکوبی کر دی جائے تاکہ کہیں سے اسلام کا نام نہ بلند ہو جو یہودیوں کو سراسیمگی میں مبتلا کر سکتا ہو۔ کیونکہ اسلام اگر غالب آجائے تو لامحالہ اسرائیل اور عالمی صیہونیت ختم ہو کر رہے گی۔"

اخبار المدینہ کے اس تبصرے پر ہم کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

---

[1] یہ صرف یہودیوں کا نقطۂ نظر ہی نہیں ہے بلکہ امریکہ، برطانیہ، اور پوری مغربی دنیا کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے اسی لیے ان لوگوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے شام، مصر، الجزائر، عراق، یمن اور جنوبی عرب کو روس کی گود میں پھینکا ہے تاکہ اسلام کا کسی طرح استیصال ہو، خواہ اس کی جگہ کمیونزم ہی لے لے۔ اسلام اور کمیونزم کے درمیان کسی ایک کو انتخاب کر لینے کا سوال ان کے سامنے آئے تو یہ بلا تامل کمیونزم کو ترجیح دیں گے۔

# انسانی جان اور جسم کے خلاف جرائم کی سزا

## اسلامی قانون میں

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر

ترجمہ : معروف شاہ شیرازی

انسان کی ذات کے خلاف جن جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے فقہاء انہیں دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں ایک وہ جرائم جن کے نتیجے میں موت واقع ہو جاتی ہے - ان کو نفسِ انسانی کے خلاف جرائم ( CRIMES AGAINST PERSON ) کہتے ہیں - دوسرے وہ جرائم جن کے نتیجے میں موت سے کم درجے کی مضرت انسانی جسم کو پہنچتی ہے - ایسے جرائم کو جسم انسانی کے خلاف جرم (GRIME AGAINST BODY) کہتے ہیں - پہلی قسم یعنی قتل کی پھر کئی قسمیں ہیں - قتلِ عمد (جان بوجھ کر قتل کے ارادے سے قتل کرنا) قتل شبہ عمد (جس میں یہ شبہ کرنے کا موقع ہو کہ قتل کی نیت سے قتل کیا گیا ہے) قتلِ خطاء (جو قتل بلا ارادہ غلطی سے ہو گیا ہو) - قتل جاری مجریٰ الخطاء (جو قتل بلا ارادہ قتل کے درجہ میں ہو) - اور قتل بالسببیت (قتل کا سبب بننا) - قتل کی ان اقسام کے ناموں اور تعریفوں کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی تفصیل اپنی جگہ ان شاء اللہ آئے گی -

رہے وہ جرائم جو جسم انسانی کے خلاف کیے جاتے ہیں اور ان کے نتیجے میں موت واقع نہیں ہوتی ، تو ان کی بھی کئی اقسام ہیں - ایک وہ جرائم جو انسانی جسم کے اعضاء پر واقع ہوں - دوسرے وہ جرائم جن کی وجہ سے اعضاء کی سود مندی جاتی رہے - تیسرے سر اور چہرے کے خلاف جرائم جنہیں فقہاء "شجاج" ( FRACTURE ) کہتے ہیں - چوتھے وہ جو جسم کے بقیہ حصوں کے خلاف سرزد ہوں جنہیں "جراح" (زخم) سے تعبیر کیا جاتا ہے -

ان جرائم میں سے اکثر کے لیے تو اسلامی شریعت نے پہلے سے متعین سزائیں تجویز کر دی ہیں۔ مثلاً قتلِ عمد میں قصاص واجب ہے، اور اگر کسی وجہ سے قصاص ساقط ہو جائے تو خونبہا اس کی جگہ لے لیتا ہے الا یہ کہ ورثائے مقتول نے بغیر کسی عوض کے مجرم کو معاف کر دیا ہو۔ اس صورت میں اس پر دیت واجب نہ ہو گی۔ مزید برآں قاتل کے لیے ایک سزا یہ بھی ہے کہ اگر وہ مقتول کا وارث ہو تو اس کی میراث سے محروم ہو جائے گا۔

قتل شبہ عمد میں دیت واجب ہے اور اس کے علاوہ دوسری سزائیں ہیں۔ مثلاً میراث سے محرومی اور کفارہ کی ادائیگی۔ اگرچہ کفارہ کی ادائیگی میں فقہاء کے درمیان اختلاف بھی ہے۔

قتلِ خطاء اور جاری مجری الخطاء میں دیت، کفارہ اور میراثِ مقتول سے محرومی ہے۔

قتلِ بسببیت میں صرف دیت کی سزا ہوتی ہے۔ نہ کفارہ واجب ہوتا ہے اور نہ مجرم کو میراث سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ البتہ بعض فقہاء اس کا بھی وہی حکم بتاتے ہیں جو قتلِ خطاء کا ہے۔

یہ تو تھیں قتل کی مختلف اقسام۔ رہے وہ جرائم جن سے جسم انسانی کو مضرت پہنچتی ہے تو ان کا ارتکاب اگر عمداً کیا گیا ہو تو ان میں قصاص واجب ہے، بشرطیکہ نفاذِ قصاص کی جملہ شرائط پوری ہو رہی ہوں، خصوصاً ظالم اور مظلوم کے اعضاء کی مماثلت اور اس بات کا امکان کہ ضرر رسیدہ کے عضو کا بدلہ ظالم کے ویسے ہی عضو سے لیا جا سکے۔ اور اگر کسی وجہ سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے تو پھر جیسی صورتِ حال ہو اس کے لحاظ سے یا تو دیت واجب ہوتی ہے یا زخم کا معاوضہ دلایا جاتا ہے۔ نیز ان جرائم میں بھی حسبِ حال دیت یا معاوضہ واجب ہوتا ہے جو مجرم کے ارادے کے بغیر کسی انسانی جسم کے خلاف سرزد ہو جائیں۔

اس بحث سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو جرائم انسانی جان یا انسانی جسم کے خلاف سرزد ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر کے لیے شریعت نے پہلے سے سزائیں مقرر کر رکھی ہیں اور ان کی نوعیت غیر معین سزاؤں، یعنی تعزیرات سے مختلف ہے۔ نیز یہ بات بھی اس سے معلوم ہو جاتی ہے کہ قصاص کی سزا صرف اس وقت نافذ ہوتی ہے جب چند خاص اور متعین شرطیں پائی جاتی ہوں، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو پھر قصاص کی جگہ دیت واجب ہو جاتی ہے۔

اب میں مختصراً قصاص کی شرائط اور وہ صورتیں بیان کروں گا جن میں وہ شرائط پوری نہیں ہوتیں تاکہ یہ

معلوم ہو سکے کہ قصاص کے مقدمات میں تعزیر کا موقع کہاں کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح میں ان حالات کی وضاحت بھی کروں گا جن میں دیت یا معاوضۂ زخم ضروری ہوتے ہیں، کیونکہ یہ معاوضے حکومت کو نہیں بلکہ شخص متضرر یا اس کے ورثاء کو دیئے جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ بحث بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ ان معاملات میں آیا تعزیری سزا دینا بھی جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں بحث کا ایک حصہ قتل اور اس کے مختلف حالات کے لیے مخصوص ہوگا اور دوسرے حصہ میں وہ جرائم بیان ہوں گے جن کا ارتکاب جسم انسانی کے خلاف ہوتا ہے

## قتل کی مختلف اقسام

**۱۔ قتلِ عمد** اس سے قبل ہم یہ کہہ آئے ہیں کہ اسلامی قانون میں قتلِ عمد کے ارتکاب پر قصاص واجب ہے، لیکن وجوبِ قصاص کے لیے قصاص کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ قصاص کی اہم شرائط یہ ہیں کہ جہاں تک قاتل کا تعلق ہے، اس نے قتل کا ارتکاب عمداً کیا ہو اور اس کے ارادۂ قتل میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو، وہ مختار ہو (یعنی اپنے اختیار سے کام کرنے والا ہو)، وہ خود براہِ راست اس فعل کا مرتکب ہوا ہو، اور جہاں تک مقتول کا تعلق ہے وہ قاتل کا جز (اولاد) نہ ہو، ہر لحاظ سے معصوم الدم ہو، اور اس کا خون قاتل کے خون کے برابر ہو۔ مزید براں یہ بھی ایک اہم شرط ہے کہ مقتول کے ورثا قصاص کے طالب بھی ہوں ——— اگر ورثاء کی جانب سے خون معاف کر دیا جائے، کسی عوض کے مقابلے میں یا بلا معاوضہ[۱]، تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور قاضی کے لیے قصاص کے نفاذ کا حکم دینا جائز نہ ہوگا۔

ان شرائط میں سے اگر کوئی شرط نہ پائی جاتی ہو تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور خونبہا واجب ہوگا۔ الّا یہ کہ ورثاء بغیر معاوضہ کے خون معاف کر دیں۔ اس صورت میں خونبہا بھی واجب نہ ہوگا۔ اب ہم ان صورتوں سے قدرے تفصیلی بحث کریں گے جن میں قصاص کی شرائط میں سے کوئی شرط نہیں پائی جاتی اور توضیح کے لیے ہم ہر صورت کو مثالوں سے واضح کریں گے

(۱) شرائط قصاص میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ قاتل نے قتل کا ارتکاب عمداً کیا ہو اور اس میں کوئی

[۱] البدائع والصنائع، الکاسانی ج ۷، ص ۲۴۲ اور اس کے بعد۔

شبہ نہ ہو۔ اگر قتل بالارادہ نہ ہو تو اس میں قصاص واجب نہیں، دیت واجب ہے، جس کا حکم عنقریب آرہا ہے۔

قتل بالارادہ میں شبہ واقع ہو جانے کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ قتل میں دو افراد شریک ہوں اور ان میں سے ایک ایسا ہو کہ اگر وہ اکیلا قتل کا ارتکاب کرتا تو قصاص واجب ہو جاتا، اور دوسرا ایسا ہو کہ اگر وہ اکیلا قتل کرتا تو قصاص واجب نہ ہوتا۔ مثلاً دو قاتلوں میں سے ایک نے عمداً ارتکاب کیا ہو اور دوسرے نے غلطی سے کیا ہو۔ یا صورت یہ ہو کہ ان میں ایک مکلّف ہو اور دوسرا غیر مکلّف، مثلاً نابالغ یا مجنون۔

اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک پر بھی قصاص واجب نہ ہوگا بلکہ دونوں پر دیت واجب ہوگی۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عمداً ارتکاب کرنے والے پر قصاص ہے اور نابالغ یا غلطی سے ارتکاب کرنے والے پر نصف دیت۔

امام ابوحنیفہؒ کا استدلال یہ ہے کہ فعل قتل ناقابلِ تجزیہ ہے۔ اور دو آدمیوں کے مل کر قتل کرنے کی صورت میں جس طرح اس بات کا امکان ہے کہ مقتول کی موت اس شخص کی ضربات سے واقع ہوئی ہو جس پر قصاص واجب ہوتا ہے، اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے کہ ضرب کاری اس شخص کی ہو جس پر قصاص واجب نہیں ہے۔ اس سے معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور شبہ کی بنا پر قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ "شبہات کی وجہ سے حدود ساقط کر دیا کرو"۔ پھر جب قصاص ساقط ہو گیا تو اس کا بدل واجب ہوگا یعنی دیت۔

دوسری رائے کا مدار مصلحت پر ہے۔ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے خون اور جان کی حفاظت کے معاملے میں سختی برتی جائے۔ دوسرے یہ کہ قتل میں دو افراد کی شرکت کے معنی یہ ہیں کہ گویا ان میں سے ہر ایک نے فرداً فرداً قتل کیا۔ اس لیے ہر ایک کے خلاف مقدمے کا فیصلہ صرف اسی کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے گا۔ اس کے دوسرے شریک قتل کے بارے میں اگر کوئی مختلف فیصلہ ہوتا ہے تو وہ اس کے فیصلے پر اثر انداز نہ ہوگا۔

میرے خیال میں یہ رائے قابلِ ترجیح ہے کہ مشترکہ قتل میں قاتل بالارادہ پر قصاص نافذ کیا جائے، کیونکہ

جو حالات اس کے ساتھ شریک ہونے والے شخص کی ذات تک محدود ہیں، وہ اس عمداً قتل کرنے والے تک متجاوز نہ ہوں گے جس کے اندر قصاص کی تمام شرائط پوری ہو رہی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ قتل بالارادہ کی شرط بھی اس میں پائی جاتی ہے[1]۔ نیز یہ صورت بھی پیش نظر رہے کہ اگر اس بات کا قطعی تعین ممکن ہو کہ فلاں شخص کی ضرب ہی کے نتیجے میں موت واقع ہوئی ہے اور وہ قتل کا ارادہ بھی رکھتا تھا تو اس صورت میں سرے سے وہ شبہ ہی قائم نہیں رہتا جس پر امام ابوحنیفہؒ کے استدلال کا مدار ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی نفاذ قصاص لازمی ہوگا[2]۔ بشرطیکہ قتل متعلقہ شخص کی ضربات ہی کے نتیجے میں واقع ہوا ہو[3]۔

(۲) بعض فقہاء نے قتل بالارادہ کی صورت میں قاتل پر قصاص واجب ہونے کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ قتل کا ارتکاب قاتل نے خود براہِ راست کیا ہو، لیکن اگر وہ قتل کا باعث بنا ہو تو اس پر قصاص کا نفاذ نہ ہوگا۔ باعث ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص قتل کے ایسے اسباب فراہم کرے جن کے نتیجے میں عموماً قتل واقع ہو جاتا ہو۔ قتل کا حکم دینے والا اور وہ شخص جو اس کی تعمیل کرتا ہے۔ (آمر و مامور) دونوں قتل کا سبب بننے کے ضمن میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور صورتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے، اہمیت کی حامل ایک دو صورتوں اور ان کے بارے میں علماء کے درمیان ہونے والے اختلافات کا ذکر کریں گے۔

(۱) قتل کا حکم دینے والے اور اس پر عمل درآمد کرنے والے کے معاملے کی نوعیت عموماً دو طرح کی ہو سکتی ہے اور فقہاء نے ان کے احکام میں فرق کیا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ آمر و مامور کے درمیان

---

[1] یہ بات درست ہے کہ ایک شریک قاتل کے حالات دوسرے پر اثرانداز نہ ہوں گے لیکن امام ابوحنیفہ کی رائے کا مدار "شبہ" پر ہے جو نفاذ قصاص کا ایک منصوص اور مسلّمہ مانع ہے۔ (مترجم)

[2] البدائع، ج ۷، ص ۲۳۵-۲۳۶۔ بدایۃ المجتہد، ابن رُشد، ج ۲، ص ۳۳۲۔

[3] اگر یہ متعین ہو جائے کہ شرکائے قتل میں سے ایک ہی کی ضرب کے نتیجے میں موت واقع ہوئی ہے تو دوسرے شرکا دوسرے سے قاتل ہی نہیں رہتے۔ انہیں ارادۂ قتل یا اقدامِ قتل کا مجرم کہا جائے گا۔ (مترجم)

جبر و اکراہ کی حالت نہ پائی جاتی ہو اور دوسری یہ کہ حالت جبر و اکراہ موجود ہو، یعنی مامور کو ارتکابِ قتل پر مجبور کیا گیا ہو۔

پہلی صورت میں امام مالکؒ، شافعیؒ، ثوریؒ، احمدؒ اور بعض دوسرے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قصاص کا نفاذ اس شخص پر ہوگا، جس نے عملاً ارتکاب کیا ہو اور حکم دینے والے کو تعزیری سزا دی جائے گی لیکن بعض فقہاء یہ رائے رکھتے ہیں کہ دونوں کو بطورِ قصاص قتل کیا جائے گا۔

دوسری صورت، یعنی یہاں آمر کو مامور پر اقتدار حاصل ہو، یا جبر و اکراہ کی صورت ہو تو اس میں فقہاء کے تین قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ قتل کا حکم دینے والا ہی قتل کیا جائے گا اور مامور پر تعزیری سزا نافذ ہوگی یہ رائے داؤد ظاہریؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی ہے، اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے بعض دوسرے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ حکم دینے والے کو نہیں بلکہ حکم کی تعمیل کرنے والے کو قصاص میں قتل کیا جائے گا کیونکہ قتل کا ارتکاب براہ راست اس نے کیا ہے۔ امام شافعیؒ کا دوسرا قول اسی کی تائید میں ہے۔ امام مالکؒ اور کچھ دوسرے فقہاء یہ کہتے ہیں کہ دونوں کو قتل کیا جائے گا۔

بنائے اختلاف یہ ہے کہ جو لوگ مامور کو قصاص سے بری کرتے ہیں ان کا اعتماد اس دلیل پر ہے کہ ایک مجبور آدمی اس شخص کے مانند ہے جو صاحبِ اختیار نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ "جبر" شریعت میں متعدد ذمہ داریوں کے سقوط کا سبب بن جاتا ہے۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مامور کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ انہوں نے اس کے با اختیار ہونے کے پہلو کو اہمیت دی ہے، کیونکہ وہ ایک لحاظ سے مختار ہوتا ہے اور ایک پہلو سے مجبور، جیسے ایک شخص بلندی سے گرتا ہے اور ہوا اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا کر پھینک دیتی ہے۔ اور جو لوگ دونوں کو قصاص میں قتل کرنے کے قائل ہیں، وہ نہ مامور کو محض اکراہ کی وجہ سے معذور سمجھتے ہیں اور نہ آمر کو براہِ راست شریکِ قتل نہ ہونے کی وجہ سے بری الذمہ ٹھہراتے ہیں اور جو لوگ صرف آمر کو قصاص میں قتل کرنے کے قائل ہیں۔ وہ قاتل کو ایک بے جان آلۂ قتل پر قیاس کرتے ہیں، کیونکہ وہ آمر کے ہاتھ میں مسخر ہے اور اس نے جو حکم اسے دیا ہے وہ اسے رد نہیں کر سکتا۔

مالکیہ نے اپنے مسلک پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ کوئی شخص اگر بھوک کی وجہ سے مر رہا ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان کو ذبح کر کے کھالے اور اپنے آپ کو ہلاکت سے بچائے[1]۔

جو حضرات قاتل اور آمر کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرتے ہیں ان کی رائے مصر اور اکثر دوسرے ممالک کے رائج الوقت قانون تعزیرات سے مطابقت رکھتی ہے۔ ان قوانین میں شریک جرم کے لیے وہی سزا ہوتی ہے جو اس جرم کے اصل مرتکب کو دی جاتی ہے۔ جرم پر آمادہ کرنا، اس سے اتفاق کرنا اور اس میں تعاون کرنا سب کے سب شرکت جرم کی تعریف میں آتے ہیں۔ قتل کا حکم دینا اکثر صورتوں میں قتل پر اکسانے کا ہم معنی ہے، اس بنا پر جدید قانونی اصطلاح کے مطابق ایسا حکم دینے والا قتل کا ارتکاب کرنے والے کا شریک متصور ہوگا[2]۔ (باقی)

---

[1] بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ابن رشد، ج ۲، ص ۳۳۱، ۳۳۲۔ الاحکام السلطانیہ الماوردی، ص ۲۲۱۔ المغنی، ابن قدامہ، ج ۹ ص ۳۳۰، ۳۳۱۔

[2] دیکھیے الاحکام العامۃ فی قانون العقوبات۔ ڈاکٹر سعید مصطفیٰ سعید، طبع ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۲ء) ص ۲۸۳ اور اس کے بعد۔ الموسوعۃ الجنائیۃ، جندی عبدالملک ج ۱ دفعہ ۶۷۔ جرانمولان فی العقوبات ج ۱ دفعہ ۶۲۸، ۶۳۰۔

---

# اسلامی تاریخ میں عُلماء اور حکام کا کردار

(۲)

شیخ عبدالعزیز بدری، عراق

ترجمہ: خلیل حامدی صاحب

اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ بہرحال عباسی خلیفہ مہدی کے دَور میں عوام الناس ابھی تک اسلام سے وابستہ تھے، حکمران عوام کی رائے سنتے تھے اور اس کی تائید کرتے تھے اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ نیز سفیان ثوریؒ اپنے دَور کے سب سے بڑے عالم تھے اور ایسی ہستیاں ہمیشہ خال خال ہوتی ہیں۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے مختلف اَدوار میں علمائے حق کے قلوب برابر نُورِ ایمان سے منور رہے ہیں۔ انہیں ہمیشہ زندگی کے اندر اپنے صحیح مشن کا احساس و ادراک رہا ہے۔ اگرچہ اُن اَدوار میں بعض ایسے حکمران ملتے ہیں جو جادۂ حق سے منحرف ہوتے رہے ہیں اور علماء کے محاسبہ سے تنگدلی کا اظہار کرتے رہے ہیں، لیکن بایں ہمہ اس تنقید و محاسبہ کے جواب میں مختلف حکام نے مختلف رویّہ اختیار کیا ہے۔ اور اس اختلاف میں اُن کے ایمان و اسلام کے اختلافِ مراتب کا دخل رہا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

**عبدالرحمان الناصر اور قاضی مُنذِر بن سعید** اَندلس کے اُموی فرمانروا عبدالرحمان الناصر لدین اللہ نے قُرطُبہ میں قصرِ زَہراء کی تعمیر میں غیر معمولی انہماک اور شغف کا ثبوت دیا۔ اس قصر کی تعمیر اور زیب و آرائش اور میناکاری پر اُس نے ریاست کا بے پناہ روپیہ صرف کیا۔ یہ قصر درحقیقت کئی عظیم الشان محلات کے مجموعہ کا نام تھا۔ اس قصر کی تعمیر اور گلکاری کی نگرانی الناصر بنفسِ نفیس کرتا رہا اور اس میں اس قدر محو ہُوا کہ ایک مرتبہ اُس کی نمازِ جمعہ قضا ہو گئی۔ اس وقت خطبۂ جمعہ اور قضاء کا منصب مُنذِر بن سعید کے پاس تھا۔ قاضی مُنذِر بن سعید نے اس بارہ میں اپنے فرض سے عُہدہ برآ ہونے کے لیے یہ طے کیا کہ وہ الناصر

کے سامنے زوردار درس دیں گے اور اس میں قصر زہراء پر اس کے اسراف و تبذیر کا محاسبہ کریں گے۔ اور یہ درس بھی وہ قصر زہراء کی جامع مسجد میں لوگوں کے سامنے دیں گے۔ چنانچہ جب جمعہ کا دن آیا تو قاضی منذر بن سعید منبر پر فروکش ہوئے۔ الناصر بھی موجود تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ قاضی منذر نے قرآن کی اس آیت سے خطبہ کی ابتدا کی:

اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِيۡعٍ اٰيَةً تَعۡبَثُوۡنَ ۝ وَ تَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ ۝ وَ اِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِيۡنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوۡنِ ۝ وَ اتَّقُوا الَّذِىۡۤ اَمَدَّكُمۡ بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ اَمَدَّكُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّبَنِيۡنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ۝ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝ (الشعراء: ۱۳۰)

یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو تمہیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

اس کے بعد یہ آیت پڑھی:

قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ‌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (النساء: ۷۷)

کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے اور پرہیز گاروں کے لیے آخرت بہتر ہے۔

اس کے بعد انہوں نے بڑے گرجدار انداز اور شدید تر الفاظ میں عمارات پر اسراف بیجا کی مذمت کی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول بیان کیا۔

اَفَمَنۡ اَسَّسَ بُنۡيَانَهٗ عَلٰى تَقۡوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانٍ خَيۡرٌ اَمۡ مَّنۡ اَسَّسَ بُنۡيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانۡهَارَ

پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک

بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔

وادی کی کھوکھلی کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔

(التوبہ: ۱۰۹)

الغرض قاضی مُنذِر بن سعید برابر انذار و تذکیر کرتے رہے اور اسراف بے جا کرنے والوں پر تند و تیز تنقید کرتے رہے۔ موصوف کا یہ وعظ اس قدر مؤثر تھا کہ حاضرین پر رقّت طاری ہوگئی اور وہ خدا کے خوف سے لرز گئے۔ خود عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ پر بھی اس وعظ کا بے پناہ اثر ہوا۔ اور وہ یہ بھی تاڑ گیا کہ قاضی کا روئے سخن اس کی طرف ہے۔ چنانچہ وہ اشکبار ہوگیا اور اپنے کیے پر اسے سخت ندامت ہوئی۔ لیکن اس کا نفس اس علانیہ محاسبہ اور تلخ تنقید کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اپنے لڑکے الحکم سے شکوہ کے انداز میں کہا: "خدا کی قسم۔ قاضی مُنذِر نے اپنی تقریر میں دراصل مجھے نشانہ بنایا ہے اور میرے سوا کسی اور کی جانب اُن کا یہ رُوئے سخن ہرگز نہیں تھا۔ اُس نے ضرورت سے زیادہ مجھ پر گرفت کی ہے اور میری زجر و توبیخ میں حد سے تجاوز کیا ہے۔" اس نے قاضی کے الفاظ دُہرانے شروع کر دیئے اور انہیں دُہراتے ہوئے غضب آلود ہوگیا اور قاضی کو اس سخت گیری کی سزا دینے کا تہیہ کر لیا۔ حتیٰ کہ یہ قسم کھالی کہ قاضی مُنذِر کے پیچھے وہ نماز جمعہ نہیں پڑھے گا۔ اس کے بعد اُس نے جامع قرطبہ کے خطیب احمد بن مطرف کے پیچھے پابندی کے ساتھ نماز جمعہ پڑھنی شروع کر دی ——— بس یہ تھی الناصر لدین اللہ کی طرف سے قاضی منذر بن سعید کو سزا۔

لیکن جب الحکم نے قصر زہرا کے ساتھ اپنے والد کی غیر معمولی دلبستگی اور قصر کی عظیم الشان مسجد کے ساتھ اُس کی محبت کو دیکھا تو اُس سے کہا: اگر آپ کو قاضی مُنذِر بن سعید ناپسند ہے تو آپ اُسے امامتِ صلوٰۃ سے معزول کیوں نہیں کر دیتے؟ الناصر لدین اللہ نے اپنے بیٹے الحکم کو ڈانٹ کر جواب دیا: تیری ماں مرے کیا منذر بن سعید جیسے صاحبِ علم و فضل اور صاحبِ تقویٰ و طہارت کو ایک ایسے نفس کی تسکین کی خاطر برطرف کر دیا جائے جو راہِ صواب سے منحرف اور بے اعتدالیوں پر مائل ہوگیا ہے؟ یہ بات ہرگز نہیں ہوگی۔ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں نماز جمعہ کے اندر اپنے اور اُس کے درمیان منذر بن سعید جیسے متقی و راست باز انسان کو شفیع بنانا ترک کر دوں۔ بے شک قاضی مُنذِر نے مجھے نازک پوزیشن میں ڈال دیا تھا

اور میں نے بھی طیش میں آکر قسم کھائی تھی لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کا کفارہ ادا کرنے کی کوئی سبیل پاؤں۔ مُنذِر بن سعید جب تک زندہ ہے اور جب تک ہم زندہ ہیں انشاء اللہ خطابت کے منصب پر وہی فائز رہے گا۔ میرا یہ خیال ہے کہ اس کا بدل ہم ہرگز نہیں پا سکتے۔[1]

**شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مثال** شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ حضرت ممدوح مسجد کے منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے دورانِ وعظ خلیفہ مقتفی لامر اللہ کا محاسبہ شروع کر دیا۔ مقتفی لامر اللہ نے یحییٰ بن سعید (جو ابن المزاحم کے نام سے مشہور تھا) جیسے ظالم شخص کو قضاء کے عہدہ پر متعین کر دیا تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی نے مقتفی کی اس نامزدگی پر سخت نکیر کی اور اُس کا نام لے کر فرمایا: "تو نے مسلمانوں پر ایسے شخص کو مسلط کر دیا ہے جو اظلم الظالمین ہے، کل پروردگارِ عالم کے سامنے تو اس زیادتی کا کیا جواب دے گا جو ارحم الراحمین ہے"۔ مقتفی لامر اللہ سامعین کے اندر موجود تھا۔ وہ حضرت ممدوح کی اس بات سے کانپ اٹھا اور اسی وقت یحییٰ بن سعید کے عزل کا حکم جاری کر دیا۔[2]

**قومی غداری پر عزّ بن عبدالسلام کی شدید گرفت** عزّ بن عبدالسلام جو سلطان العلماء کے لقب سے پکارے جاتے تھے، الملک الصالح اسماعیل کی طرف سے ۶۳۷ھ میں دمشق کی جامع مسجد کے خطیب مقرر کیے گئے مگر موصوف زیادہ دیر تک اس منصب پر فائز نہ رہ سکے کیونکہ اگلے ہی سال ۶۳۸ھ میں انہیں معزول کر دیا گیا۔ اس معزولی کا پس منظر یہ تھا کہ عزّ بن عبدالسلام نے ملک اسماعیل کی ایک بہت بڑی سیاسی خیانت پر محاسبہ کیا تھا۔ ملک اسماعیل کی اس سیاسی خیانت کی تفصیل ثقہ مؤرخین نے یہ بیان کی ہے کہ ملک اسماعیل مصر کے حاکم نجم الدین بن ایوب سے خائف رہتا تھا۔ آخر کار اُس نے صلیبی افرنگیوں سے دوستانہ معاہدہ کر لیا اور نجم الدین کے خلاف اُن کی امداد حاصل کی۔ اس امداد کے عوض اُس نے صفد کے قلعہ اور اُس کے اطراف، قلعہ الشقیف اور اس کے اطراف صَیدا اور طَبَریہ کا نصف، جبلِ عامل اور ساحلی شہروں کو افرنگیوں کے

---

[1] من اخلاق العلماء از استاذ عبدالحمید العبادی

[2] قلائد الجواہر ص ۸

حوالے کر دیا[1]۔ یہ تمام اہم فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ مزید برآں ملک اسماعیل نے افرنگیوں کو دمشق میں داخل ہونے اور جنگی ہتھیار خریدنے کی بھی اجازت دے دی۔ عزبن عبد السلام نے ملک اسماعیل کے اس اقدام کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔ نہ صرف فتویٰ جاری کیا، بلکہ جمعہ کے روز منبر پر چڑھ کر ملک اسماعیل کا شدید محاسبہ کیا، اُس کے اس اقدام کو ملتِ اسلامیہ کے حق میں عظیم خیانت قرار دیا، اور اُس کے ملی نقصانات واضح کیے۔ اور خطبہ کے اندر ملک اسماعیل کے حق میں کوئی دعا نہ کی، حالانکہ اُس زمانے میں خطبے کے اندر سلطان کے حق میں دعا مانگنا سلطان کی وفاداری اور اطاعت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے یہ دُعا مانگی: "اے اللہ، اس اُمت کو راست روی پر قائم رکھ۔ ایسی راست روی کہ جس سے تیرے فرمانبردار عزت یاب ہوں اور تیرے دشمن ذلیل و رسوا ہوں۔ اور تیری اطاعت پر عمل ہو اور تیری معصیت سے اجتناب ہو۔" عزبن عبد السلام یہ دعا مانگ رہے تھے اور حاضرین کا انبوہِ کثیر اسے ساتھ ساتھ دُہرا رہا تھا اور آمین پکار رہا تھا۔

سلطان اسماعیل اُس وقت دمشق سے باہر تھا۔ سرکاری خبر رسانوں نے اُسے عزبن عبد السلام کے اس رویہ کی اطلاع بھیجی۔ سلطان کی طرف سے عزبن عبد السلام کی منصبِ خطابت سے فوری برطرفی اور گرفتاری کا پروانہ پہنچ گیا۔ کچھ مدت وہ جیل میں رہے۔ پھر جب سلطان واپس دمشق آیا تو اُس نے عزبن عبد السلام کو جیل سے رہا کر کے خانہ نشین کر دیا اور حکم دیا کہ آئندہ وہ کوئی فتویٰ جاری نہیں کریں گے[2]۔

امام ابن تیمیہؒ غازان کے دربار میں | شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی مثال لیجیے۔ انہوں نے تاتاری حکمران غازان کے سامنے کس قدر حیرت انگیز جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ غازان تاتاری حکمرانوں میں سے چوتھا مسلمان حاکم تھا۔ سنہ ۶۹۸ھ کے اواخر میں یہ خبر گرم ہوئی کہ وہ لشکرِ گراں کے ساتھ ایران کی جانب سے حلب پر چڑھائی کر رہا ہے۔ چنانچہ ربیع الاول سنہ ۶۹۹ھ کی ستائیس تاریخ کو وادی سلمیّہ کے مقام پر اس کی فوجوں اور ناصر بن قلاوون (والیٔ مصر) کی سپاہ کے مابین مڈبھیڑ ہوئی اور سخت خونریز جنگ کے بعد بالآخر ناصر بن قلاوون کے لشکر کو شکست

---

[1] مقریزی نے السلوک میں یہی علاقے بیان کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو قسم دوم ج اول ص ۳۰۳۔ دوسرے مؤرخین مثلاً سبط ابن الجوزی نے صرف قلعہ الشقیف اور صفد کا ذکر کیا ہے۔ سبکی نے صرف صیدا شہر لکھا ہے۔

[2] طبقات از سبکی۔ السلوک از مقریزی۔

ہوئی۔ اس شکست نے سب کے حواس پراگندہ کر دیئے۔ کیا سپاہی اور کیا اُمراء تمام میدانِ جنگ سے اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے۔ دمشق کے اعیان و اکابر نے بھی ناصر بن قلاوون کے پیچھے پیچھے مصر کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہر تمام بڑے آدمیوں سے خالی ہو گیا۔ کوئی حاکم اور نظم و نسق کو بحال رکھنے والا باقی نہ رہا۔ صرف شیخ الاسلام تھے جو بے سہارا عوام کے درمیان استقلال و عزیمت کی پوری شان کے ساتھ موجود تھے۔ شہر کے اندر جو چند بچے کھچے سر کردہ لوگ رہ گئے تھے، شیخ الاسلامؒ نے ان کو جمع کیا اور نظم و نسق برقرار رکھنے کی صورت پیدا کی، اور طے پایا کہ ایک وفد کی صورت میں شاہِ تاتار سے ملاقات کی جائے اور اُسے آمادہ کیا جائے کہ دمشق میں نہ داخل ہو۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وفد لے کر شاہِ تاتار کے لشکر میں پہنچے اور مقام نبک پر اس سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں شیخ الاسلام اور غازان کے درمیان بڑی تند و تیز بحث ہوئی۔ شیخ الاسلام نے پوری جرأت کے ساتھ غازان کا محاسبہ کیا اور اُس کی اس غلط کارروائی اور عہد شکنی پر بے خوف تنقید کی۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں شیخ الاسلام کی اس جرأت مندانہ گفتگو کو ایک صالح راوی شیخ ابوعبداللہ محمد بن عمر البالسی کے حوالے سے بتفصیل بیان کیا ہے۔ شیخ البالسی امام ابن تیمیہؒ کے ساتھ اس وفد میں شریک تھے۔ ان کا بیان ہے:

"امام صاحب نے ترجمان کی وساطت سے سلطانِ تاتار سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: اے غازان! تیرا دعویٰ ہے کہ تو مسلمان ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ تیرے ساتھ قاضی صاحب بھی ہیں، شیخ بھی اور امام بھی، اور اذان دینے والے مؤذن بھی۔ تو نے آخر کس دلیل سے ہم پر لشکر کشی کی ہے اور ہمارے شہروں کو پامال کیا ہے؟ تیرے باپ دادا کافر تھے، لیکن انہوں نے ہم سے عہد استوار کرنے کے بعد بلادِ اسلام میں قدم نہیں رکھا۔ لیکن تو نے پیمان وفا باندھا اور پھر مسلمان ہو کر غداری کی۔ تو نے اپنی زبان سے جو کچھ کہا اُس پر عمل نہیں کیا۔ الغرض ابن تیمیہؒ اور غازان کے درمیان اور بھی ایسی باتیں ہوئیں جنہیں ابن تیمیہؒ نے صرف رضائے الٰہی کے پیش نظر واشگاف بیان کیا۔ انہوں نے جس بات کو حق سمجھا اسے غازان کے گوش گزار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے خوف کو دل میں جگہ نہ دی۔ پھر غازان کی طرف سے دسترخوان چنا گیا۔ وفد کے ارکان اور دوسرے لوگوں نے کھانا کھایا مگر ابن تیمیہؒ نے ہاتھ روک لیا۔ اُن سے پوچھا گیا آپ کیوں نہیں کھانا تناول فرماتے؟ امام نے جواب دیا: اسے

سُلطان ، میں تیرا کھانا کس طرح کھا سکتا ہوں ؟ یہ کھانا وہی تو ہے جو لوگوں کی بھیڑ بکریوں کو لوٹ کر تیار کیا گیا ہے اور لوگوں کے درختوں کو ناجائز کاٹ کاٹ کر پکایا گیا ہے۔ غازان امام کی باتوں کو سر جھکائے بغور سنتا رہا۔ اُس کے دل میں امام صاحب کی دہشت اور محبت دونوں گھر کر چکی تھیں۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا۔ پُوچھنے لگا یہ کون بزرگ ہیں ؟ مَیں نے آج تک اس جگرے کا آدمی نہیں دیکھا اور نہ کسی کی بات یوں میرے دل میں جاگزیں ہوئی ہے، اور نہ کسی کے سامنے مَیں نے اپنے تئیں ایسا بے بس پایا ہے۔ سلطان کو ابن تیمیہؒ کے حالات اور ان کے علم و عمل کا مرتبہ بتایا گیا۔ غازان نے امام صاحبؒ سے دعا کی درخواست کی۔ امام صاحبؒ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا:

اَے اللہ ، اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ غازان نے اس لیے تلوار برہنہ کر رکھی ہے کہ تیرا کلمہ بلند ہو اور دین پُورے کا پُورا تیرے لیے ہو جائے تو تُو اِس کی تائید و نصرت فرما اور ملکوں اور انسانوں کا اسے حاکم بنا۔ اور اگر اِس کی جنگ محض ریاکاری، شہرت طلبی اور دنیا پرستی کے لیے ہے اور اس غرض کے لیے ہے کہ اس کی بادشاہت کا سکّہ رواں ہو اور اسلام اور مسلمان رُسوا ہوں تو اس کو خوب پکڑ، اسے ہلا مار، اس کا ستیاناس کر اور اس کی بیخ کنی کر۔ حالت یہ تھی کہ امام صاحب یہ دُعا کر رہے تھے اور غازان کی زبان سے بے ساختہ آمین آمین نکل رہا تھا۔ اور اس نے ہاتھ اوپر اُٹھا رکھے تھے۔ بالسی کا بیان ہے کہ ہم اس خوف سے اپنا دامن سمیٹ رہے تھے کہ امام صاحب کی گردن ضرور اڑا دی جائے گی اور خون کے چھینٹوں سے ہمارے لباس تر ہو جائیں گے جب ہم دربار سلطانی سے اُٹھ کر باہر آئے تو قاضی القضاۃ نجم الدین اور دوسرے ارکانِ وفد نے کہا آپ نے تو اپنے آپ کو بھی اور ہمیں بھی مار ڈالا تھا۔ آپ جائیے بخدا ہم اب آپ کے ساتھ نہیں جاتے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا بخدا میں خود بھی آپ لوگوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ بالسی کا بیان ہے کہ سب لوگ گروہ کی صورت میں چل کھڑے ہوئے۔ صرف امام صاحبؒ اور ان کے تلامذہ رہ گئے۔ امام صاحبؒ کے اس کارنامہ کا چرچا غازان کے لشکر کی عورتوں اور افسروں اور امراء تک پہنچا تو وہ سب امام صاحبؒ کے استقبال اور حصولِ دیدار اور دُعا کے لیے نکلے اور اسی ہجوم کے اندر وہ دمشق روانہ ہوئے۔ جب دمشق میں داخل ہوئے تو حالت یہ تھی کہ تین سو سوار اُن کے ہمرکاب تھے۔ اور میں بھی — یعنی بالسی — اُن میں شامل تھا۔ جن لوگوں نے امام صاحب کی رفاقت سے انکار کر دیا تھا وہ راستے ہی میں تھے کہ تاتاریوں کا ایک

وستہ اُن پر ٹوٹ پڑا اور ان کے کپڑے اُتروا لیے اور جو کچھ اُن کے پاس تھا لوٹ لیا۔[1]

**ماضی وحال کا واضح اختلاف** علمائے اسلام نے حکمرانوں کا جو محاسبہ کیا ہے اس کی یہ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اس بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے اور محاسبہ کرنے والے یا محاسبہ کی گنجائش نہ رکھنے والے کی سزا کیا ہے۔ آپ تاریخ اسلامی پر اگر طائرانہ نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ملتِ اسلامی کے حکمرانوں اور محکوموں دونوں فریقوں نے اس فرض کو باحسن وجوہ قائم کیا ہے۔ خلاف شرع امور پر حکام کی گرفت یا ان کی منافیٔ اسلام باتوں کے محاسبہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کی ذات کو ہدف بنایا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے سوا ہر انسان سے غلطی اور لغزش کا صدور ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر حکمرانوں کے عیوب اور ناروا تصرفات کا نوٹس لیا جائے تو اس سے ان کی اصلاح ہو گی اور ان کی کجروی راست روی میں تبدیل ہو گی۔ اور عربی کا مقولہ ہے کہ سعادت مند وہ شخص ہے جسے اگر نصیحت کی جائے تو وہ اُسے قبول کرے اور اگر اُس کا محاسبہ کیا جائے تو وہ راہ یاب ہو جائے۔

لیکن افسوس ہے کہ حالات کے اندر توازن نہیں رہا ہے۔ کافر استعمار نے جب دولتِ اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا اور نظامِ خلافت کی بساط اُلٹ دی تو اُس نے مسلمان ملکوں پر قبضہ کرنے کے بعد خود مسلمانوں کے اندر ایسے حکام پیدا کر دیے جو مسلمانوں پر اسلام کے تحت فریضۂ حکومت سرانجام دینے کے بجائے بالواسطہ یا بلاواسطہ استعماری اغراض و مقاصد کے تحت مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے ہیں۔ جب مسلمان اُن سے اسلام کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کے اہلِ علم اُن کا محاسبہ کرتے ہیں تو ان کی پیشانیوں پر شکن آ جاتے ہیں، آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں، دل بھینچنے لگتے ہیں، اور سینے کھولنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ آخر کیوں اسلام سے اس قدر برافروختہ ہیں؟ اسلام وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔ یہ دین صرف عبادات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اخلاق، ریاست، حکومت، قانون و نظام غرض زندگی کا ہر پہلو اس کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ رعایا تمام تر مسلمان ہے اور آپ مسلمان رعایا کے سربراہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔

[1] مختصر منہاج السنۃ از امام ذہبی، ص ۳۲۳۔

(جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے تحت فیصلہ نہ کریں وہی کفر کرنے والے ہیں)۔ بعض لوگ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ داعیانِ اسلام آج اگر حکام پر کوئی تنقید کریں یا سیاسی پہلو سے دین کی کوئی خدمت کریں تو انہیں قطعاً اجازت نہیں دی جاتی۔ حالانکہ اسلامی ممالک کے تمام حکمران جمہوریت کے دعویدار ہیں اور جمہوریت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ رائے اور تنقید کی آزادی ہو؟ اس سوال کا جواب ہمارے بجائے راسخین فی العلم، امت کے باشعور گروہ اور خود حکام کو دینا چاہیے۔

---

# رسائل و مسائل

## مختلف احوال میں تحریک اسلامی کا طریق کار

سوال ملا :- ہمارے اسلامی حلقوں میں آج کل یہ موضوع زیر بحث ہے کہ جس ملک میں غیر مسلموں کو مسلمانوں پر تسلط حاصل ہو، وہاں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو مسلمانوں کے قومی معاملات میں کس حد تک دلچسپی لینی چاہیے۔ جو لوگ ان مسائل میں حصّہ لینے کے حامی ہیں وہ فرعون کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ کی اُن مساعی کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے بچا کر لے جانے کے لیے انہوں نے اختیار فرمائیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرے لوگ یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ ان معاملات میں اُلجھ جانے کے بعد تحریک اسلامی کا اصولی موقف مجروح ہو جائے گا اور اس کی بین الاقوامی اور بین الانسانی دعوت اپنا اپیل کھو بیٹھے گی۔ فریقِ اوّل کے استدلال کا اہم اور مرکزی نکتہ یہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کو اللہ نے بعثتِ محمدی سے قبل اقوامِ عالم میں منتخب اور افضل تر قرار دیا تھا، اسی طرح دنیا اور دنیا کے جس ملک میں بھی مسلمان نام کی ایک قوم آباد ہے، وہ بھی برگزیدہ اور مجتبیٰ ہے۔ اس لیے اس قوم کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس کے پرسنل لا اور تعلیمی و تہذیبی ادارات کا بقا اقامتِ دین کے لیے ناگزیر اور اوّلین توجہ کا مستحق ہے۔

دوسرے لفظوں میں جب نبوت بین الاقوامی دور میں داخل ہوئی اور ایک سے زائد اقوام کے لیے ایک ہی نبی مبعوث ہونے لگے تو جس طرح ایک قوم کے اندر ایک فرد کو منتخب کر کے نبوت سے سرفراز کیا جاتا تھا، اسی طرح اقوامِ عالم میں سے بھی ایک قوم کو چُن کر کارِ نبوت کی انجام دہی پر مامور کیا گیا۔ چنانچہ فرعون کو دعوتِ ایمان دینا حضرت موسیٰ کے مشن کا جز صرف اسی

حد تک تھا جس حد تک بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے اس کی ضرورت تھی۔

آپ سے استدعا ہے کہ ایک غیر مسلم اقتدار کے دائرے میں آپ اقامتِ دین کا طریق کار واضح کریں اور بتائیں کہ حضرت موسیٰ کی دعوت کا جو تعلق بنی اسرائیل اور قومِ فرعون سے تھا، اس کی صحیح نوعیت آپ کے نزدیک کیا تھی اور بنی اسرائیل کے قومی مسائل پر انھوں نے خصوصی توجہ کیوں مبذول فرمائی؟

جواب - میں نے اس بحث کا بغور مطالعہ کیا جو آج کل آپ کے ہاں چل رہی ہے۔ اس معاملہ میں میری رائے مختصراً یہ ہے کہ اسلام کی دعوت و اقامت کے لیے جو شخص یا گروہ کسی ملک اور کسی زمانے میں کام کرنے کے لیے اُٹھے، وہ اگرچہ ایک ایسی سچائی کا علمبردار ہوتا ہے جو زمان و مکاں کی قیود سے بالاتر ہوتی ہے اور ایک ایسی اصولی ہدایت و تعلیم پیش کرتا ہے جو ہر دَور اور مقام کے لوگوں کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ لیکن جس ملک اور معاشرے میں وہ کام کرنے اٹھا ہو اس کے حالات سے وہ یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ محض مبلغ نہیں ہے بلکہ عملاً اقامت دین کرنا اس کے پیشِ نظر ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وقت اور مقام کے حالات کو اپنی دعوت کے نقطۂ نظر سے دیکھے اور سمجھے اور دعوت کے لیے ایسا طریقِ کار اختیار کرے جو ان حالات میں مناسب ترین ہو۔ اسے لامحالہ یہ دیکھنا ہو گا کہ جس معاشرے میں وہ کام کرنے اٹھا ہے آیا وہ خالص غیر مسلم معاشرہ ہے، یا اس میں کچھ لوگ پہلے سے اسلام کے ماننے والے موجود ہیں، یا وہاں غالب اکثریت اسلام کے ماننے والوں کی ہے۔ ان تینوں صورتوں میں دعوت کا طریقِ کار یکساں نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ مختلف نوعیت کے معاشرے بھی تمام دنیا میں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کہیں مثلاً امریکہ یا جاپان کے سے حالات ہوتے ہیں اور کہیں چین یا روس جیسے کہیں ہندوستان جیسے حالات ہوتے ہیں اور کہیں سیلون جیسے۔ کہیں پاکستان جیسے حالات ہوتے ہیں اور کہیں مصر اور شام جیسے اور کہیں ترکی جیسے۔ اسلام کی اصولی دعوت اگرچہ ان سب کے لیے ایک ہی ہے۔ لیکن اس کے لیے کام کرنے والا اگر حکیم ہے تو وہ ہر جگہ ایک ہی نسخہ استعمال نہیں کرے گا بلکہ مرض اور مریضوں کی کیفیت کے لحاظ سے ہر مقام کے لیے نسخہ میں مناسب ردّ و بدل کرے گا۔

انبیاء علیہم السلام نے جس طرح مختلف حالات میں کام کیا ہے اس سے ہم یہ حکمت تو سیکھ سکتے ہیں کہ اصولی

دعوت کو برقرار رکھتے ہوئے طریق کار میں حالات کے اختلاف کا لحاظ کرتے ہوئے کیا فرق ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں ہم کام کر رہے ہوں وہاں کے حالات بعینہٖ وہی ہوں جو کسی نبی کے عہد میں تھے۔ تاہم چونکہ آپ کے بھیجے ہوئے سوال میں حضرت موسیٰ کی نظیر کو زیر بحث لایا گیا ہے اس لیے اس کے بارے میں میں یہ عرض کروں گا کہ مصر میں ایک طرف تو ۱۰ اور ۲۰ فیصدی کے درمیان مسلم آبادی موجود تھی، اور دوسری طرف غیر مسلم حکمران اکثریت میں تاریخی اسباب سے اسلام و اہلِ اسلام کے خلاف سخت جذبۂ عناد پایا جاتا تھا۔ ان حالات میں حضرت موسیٰ کی دعوت کا طریقہ ان انبیاء کی دعوتوں سے مختلف تھا جو خالص غیر مسلم معاشرے میں کام کرنے اٹھے تھے۔ حضرت موسیٰ اگرچہ فرعون اور اس کی قوم کے سامنے اسلام کی اصولی دعوت بھی پیش کر رہے تھے، لیکن وہ اُس مسلم عنصر سے بھی بے نیاز اور بے تعلق نہیں رہے جو مصر میں موجود تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اسی عنصر کے ساتھ منسلک (IDENTIFY) کیا، کیونکہ اس سے بے اعتنائی (INDIFFERENT) ہونا قطعی غیر فطری امر تھا۔ انہوں نے مصریوں کو اسلام کی طرف بلانے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں بھی دینی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جو پہلے سے اسلام کو مانے ہوئے تھے اگرچہ اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مزید براں یہ بھی ان کے مشن کا ایک لازمی جز تھا کہ ان مسلمانوں کو کفر کے غلبہ سے بچائیں۔ اس معاملہ میں جس بنا پر بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی وہ میرے نزدیک صرف یہ تھی کہ مصر کے ایک اسلامی مملکت بن جانے کا اس وقت کوئی امکان نہ تھا۔ ورنہ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت اور اس کی قوم کے کارفرما عنصر کا اسلام قبول کر لینا اگر ممکن ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ بنی اسرائیل اور ان کے ساتھی مسلمانوں کو خواہ مخواہ مصر سے نکال کر کہیں اور لے جایا جاتا۔

اس نظیر سے یہ سبق ملتا ہے کہ جہاں غیر اسلام کا غلبہ ہو اور پہلے سے ایک مسلم عنصر بھی موجود ہو وہاں اسلام کی اصولی دعوت پیش کرنے والے اُس عنصر کو نظر انداز کر کے کام نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ان کا طرزِ عمل مسلم نیشنلزم کے ہر رنگ سے خالی ہونا چاہیے، لیکن ان کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلام کا جو سرمایہ پہلے سے موجود ہے اس کی حفاظت کریں اور "نئے سرمایہ" کے حصول کی فکر میں ایسے مستغرق نہ ہو جائیں کہ سابق کا سرمایہ بھی ضائع ہو جائے۔ اسی قاعدے کی پیروی کرتے ہوئے میں نے تقسیم سے پہلے یہ طریق کار اختیار

کیا تھا کہ ایک طرف مسلم و غیر مسلم سب کے سامنے اسلام کی اصولی دعوت پیش کی جاتے اور دوسری طرف ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر مسلم اکثریت میں جذب ہونے اور ان کے ظلم و ستم کا شکار ہونے سے جہاں تک ممکن ہو بچایا جاتے۔

## حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے دو اجزاء

سوال ۲۔ "سوال نمبر ۱ کے بارے میں آپ کے مختصر جواب سے اندازہ ہوا کہ میرے سوال کا مرکزی نکتہ جو حضرت موسیٰ کے مشن سے متعلق ہے جناب کی تائید سے محروم رہا اور آپ نے اپنے جواب میں اپنے اسی موقف کا اعادہ فرمایا جو اس سے قبل آپ تفہیم القرآن میں پیش فرما چکے ہیں۔ آپ کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے میں جو اشکال ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون اور آلِ فرعون کے ایمان سے مایوس ہونے کے بعد بنی اسرائیل کو لے کر ہجرت نہیں فرمائی تھی بلکہ آغاز نبوت ہی میں فرعون کے سامنے ایمان کی دعوت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ارسالِ بنی اسرائیل کا مطالبہ بھی پیش فرما دیا تھا۔ اس کی آخر کیا مصلحت تھی؟ کیا صرف ایمان کی دعوت کافی نہیں تھی؟ اس اشکال کا ایک ہی حل میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ ارسالِ بنی اسرائیل کا مطالبہ، دعوتِ ایمان کا بدل نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اگر فرعون ایمان نہ لائے تب بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کر جائیں۔ بلکہ یہ ایک مستقل مطالبہ تھا جسے اگر فرعون ایمان لے آتا تب بھی پورا کرایا جاتا۔ قرآن کا اندازِ بیان بھی اسی کی تائید کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

امید ہے کہ جناب اپنی اولین فرصت میں میری اس گزارش پر توجہ دیں گے اور اپنی دوبارہ غور فرمودہ رائے سے آگاہ فرمائیں گے۔"

جواب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے سامنے دعوتِ دین اور ارسالِ بنی اسرائیل کا مطالبہ ایک ساتھ پیش کرنا فی الواقع وہی اشکال پیدا کرتا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اس قصے کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

ارسال بنی اسرائیل کا مطالبہ آغاز ہی میں اس لیے پیش کر دیا گیا کہ ایک مسلمان قوم، جو مصر ہی میں نہیں، اس وقت پورے شرقِ اوسط میں بلکہ شاید پوری متمدن دنیا میں توحید و رسالت کی ماننے والی واحد قوم تھی۔ ایک مدت سے کفار کے شدید ظلم و ستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی تھی، اور حالات اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ اس کا مٹ جانا یا کفار میں جذب ہو جانا مستقبل قریب میں بالکل یقینی نظر آتا تھا۔ اس حالت میں یہ انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ پہلے ایک کافی مدت تک فرعون و ملأ فرعون کو دینِ حق کی دعوت دی جاتی رہے اور جب اس کے مسلمان ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہے تب یہ مطالبہ لے کر اٹھا جائے کہ جو مسلمان قوم اس کی سرزمین میں موجود ہے اُسے وہ ملک سے نکل جانے کی اجازت دے دے۔ کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا اور اس قوم کی حفاظت کے مسئلے سے قطع نظر کر کے صرف دعوتِ دین کے تقاضے پورے کیے جاتے رہتے تو ۲۵-۳۰ سال کی مدت میں، جو اہلِ مصر پر حجت پوری کرنے کے لیے درکار تھی، یہ مسلمان قوم فنا ہو جاتی، اور اس کے معنی یہ ہوتے کہ نئے سرمائے کے حصول کی فکر میں وہ سرمایہ بھی کھو دیا گیا جو پہلے سے موجود تھا۔

لیکن چونکہ حضرت موسیٰ ایک قومی لیڈر نہیں تھے، بلکہ فی الاصل ان کا مشن دعوتِ دین تھا، اس لیے انہوں نے محض ارسال بنی اسرائیل کا مطالبہ ہی نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت بھی پیش فرمائی اور آخر وقت تک اس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ دعوت اگر کامیاب ہو جاتی اور مصر کا فرمانروا طبقہ اسلام قبول کر لیتا تو پھر کوئی ضرورت نہ تھی کہ ایک مسلمان قوم خواہ مخواہ دارالاسلام سے ہجرت کر کے کسی دارالکفر کی طرف منتقل ہوتی جہاں اسے از سرِ نو کفار سے برسرِ پیکار ہونا پڑتا۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، مصر میں دعوت بے نتیجہ رہی اور آخر کار ہجرت کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس وقت اس امر کا فائدہ ظاہر ہو گیا کہ آغاز ہی میں دعوتِ دین کے ساتھ ساتھ ارسال بنی اسرائیل کا مطالبہ بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بنی اسرائیل کی پھیلی ہوئی آبادیاں ملک چھوڑ کر نکل جانے کے لیے آخری مرحلے میں یکایک تیار نہ کی جا سکتی تھیں۔ اُن میں یہ عزم صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ۲۵-۳۰ سال سے ان کو اس کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، ورنہ ان کا MORALE مدتِ دراز کی غلامی اور ظلم و ستم نے اس بری طرح توڑ دیا تھا کہ عین وقت پر اگر ان سے نکلنے کے لیے کہا جاتا تو کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتا۔

---

# مطبوعات

مقالاتِ سر سید حصہ اوّل تا حصہ ششم | مرتب : جناب محمد اسماعیل، پانی پتی ۔شائع کردہ : مجلسِ ترقی ادب لاہور۔

سر سید احمد خاں مرحوم اس برصغیر میں وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے مغرب کے سیاسی اور علمی استیلاء کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اُس کے مقابلے میں ایک ٹھوس قدم اٹھانے کی کوشش کی ۔ اس کے لیے انہوں نے جو موقف اور جو طریق کار اختیار کیا اُس سے ہمیں اختلاف ہے لیکن اس بات کے ہم ضرور معترف ہیں کہ انہوں نے اپنے انداز پر اس امر کی کوشش کی کہ کسی طرح مسلمانوں کے دین، ایمان اور اُن کے ملّی وجود کا تحفظ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جس پر بعد میں مولانا شبلی مرحوم اور اُن کے بعض ساتھیوں نے کام کیا۔ سر سید کی تحریریں ہمارے اس نئے دور کے نظریات میں ذہنی پس منظر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ متجددین ان سے کس نوعیت کے غلط فوائد اٹھا رہے ہیں یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے والے طبقے ان تحریروں کے فکری نتائج سے اس حقیقت کا پورا پورا ادراک کر سکتے ہیں کہ ذہنی مرعوبیت کے ساتھ کوئی فکری جنگ کبھی بھی کامیابی سے نہیں لڑی جا سکتی اور اس کا نتیجہ مرعوب ذہنوں کے لیے ہمیشہ تباہ کن ہوتا ہے۔

ان مقالات کو پڑھنے سے البتہ ایک بات ضرور کھل کر سامنے آتی ہے کہ سر سید اگرچہ علم دین میں راسخ نہ تھے اور اس بنا پر انہوں نے بعض مقامات پر بڑی عجیب و غریب ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن اس کے باوجود آجکل کے متجددین کے مقابلے میں اُن میں کہیں زیادہ فکری اور علمی گہرائی پائی جاتی ہے۔

ان مقالات کا حصہ اوّل جو مذہبی اور اصلاحی مضامین پر مشتمل ہے ۴۸۳ صفحات میں پھیلا ہوا ہے، اور قیمت ساڑھے چار روپے ہے۔ دوسرے حصے میں تفسیری مضامین ہیں۔ صفحات ۲۵۸ اور قیمت

ڈھائی روپے ہے۔ حصہ سوم فلسفیانہ مضامین، چہارم علمی اور تحقیقی مضامین اور ششم تاریخی مضامین پر مشتمل ہے اور ان کی قیمت بالترتیب تین روپے۔ ساڑھے پانچ روپے۔ ساڑھے چار روپے اور ساڑھے چار روپے ہے۔

سارے حصص بہترین اردو ٹائپ میں نہایت اعلیٰ معیار پر طبع کیے گئے ہیں اور قیمت خاصی کم ہے۔ پاک و ہند میں مسلمانوں کے فکری ارتقاء کا جائزہ لینے والوں کے لیے یہ مقالات اشد ضروری ہیں۔

---

**دین آباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم** | تالیف جناب سید حشمت حسین جعفری صاحب ایڈووکیٹ۔ شائع کردہ مکتبہ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ حیدر آباد (پاکستان)

یہ مسئلہ کہ کیا حضورؐ کے آباء و اجداد و امہات ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے یا نہیں، کافی مدت سے زیر بحث چلا آرہا ہے۔ اس مسئلہ کے پیچھے درحقیقت وہ نقطۂ نظر کام کر رہا ہے جس میں صلب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ حدیث اور سیر کی کتب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات تو سامنے آتی ہے کہ حضورؐ بڑی پاکیزہ صلب سے پیدا ہوئے اور آپ کے والدین جناب عبداللہ اور آمنہ اور آپ کے جد امجد جناب عبدالمطلب اور آپ کے چچا جناب ابوطالب سیرت و کردار کے اعتبار سے نہایت نیک اور بے نفس انسان تھے لیکن ان کے عقائد کے بارے میں کوئی ایسی تصریح نہیں ملتی کہ انہیں صحیح معنوں میں مومن و مسلم مان لیا جائے فاضل مصنف نے اس ضمن میں جو حدیث پیش کی ہے وہ بھی اعتقاد کے بارے میں نہیں بلکہ عمل کی پاکیزگی اور طہارت پر دلالت کرتی ہے۔

فاضل مصنف کی محنت بہر حال قابل داد ہے کہ انہوں نے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا بڑی دیدہ دری سے جائزہ لیا ہے۔ کتاب ۲۰۳ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی قیمت ڈھائی روپے ہے۔

---

**AS (WE) APPROACH ISLAM**
**جب ہم اسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں** | تالیف: جناب ڈاکٹر احمد الرحمٰن علوی ڈی لٹ۔ ناشر: نیشنل بک سنٹر حضرت گنج، لکھنؤ (بھارت)۔ قیمت ساڑھے سولہ روپے۔ صفحات ۲۴۶۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام اور اُس کے لائے ہوئے نظامِ حیات کے مختلف گوشوں کا نہایت اچھے انداز میں تعارف پیش کیا ہے۔ اعتقادی مسائل کی تصریح میں انہوں نے یونانی علم کلام اور طرزِ استدلال کو چھوڑ کر نیا طرزِ استدلال اختیار کیا ہے۔ یُوں تو یہ ساری کتاب کافی دلچسپ ہے لیکن اس کا وہ باب جس میں انہوں نے دین کے جامع تصوّر پر بحث کی ہے بڑا زوردار ہے۔ البتہ ایک بات اس پوری کتاب میں یہ کھٹکتی ہے کہ فاضل مصنف نے بعض مغربی مفکرین اور اسلام پسند اہل علم کی پیروی میں قوانینِ طبعی اور قوانینِ شرعی میں فرق نہیں کیا اور قوانین طبیعی کو اس انداز سے پیش کیا ہے گویا کہ وہ شریعت کے ضابطے ہی ہیں۔

کتاب کا معیار طباعت خاصا اونچا ہے۔ پاکستان میں یہ کس مکتبے سے مل سکتی ہے اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی۔

---

قصیدہ نعتیہ جِن۔ عمرو الجنی | تشریح و اردو ترجمہ: مولانا رحمت علی خاں سامی گجراتی۔ شائع کردہ: مکتبہ ظفر ناشر قرآنی قطعات، گجرات۔ صفحات ۸۰۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

یہ نعتیہ قصیدہ ایک عمرو الجنی نامی جِن کا ہے۔ مترجم اور شارح کو یہ قصیدہ مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی سے ملا۔ انہیں یہ کہاں سے اور کیسے پہنچا، یہ بات متحقق نہیں ہو سکی۔ بہرحال نعتِ رسول اور عربی زبان وادب، خصوصاً اس کے قدیم طرز سے محبت رکھنے والے اس میں دلچسپی کا کافی سامان پائیں گے۔ اس قصیدے کی زبان اتنی اَدَق اور مُغلَق ہے کہ مولانا رحمت علی خاں سامی جیسے فاضل ہی اس کا ترجمہ اور تشریح کر سکتے ہیں۔ کتاب کو نہایت خوبصورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔

---

مکاتیب بہادر یار جنگ | ناشر: بہادر یار جنگ اکادمی، بی اے۔ ۱۴، اے سراج الدولہ روڈ، بہادر آباد، کراچی۔ قیمت دس روپے۔ جلد خصوصی پندرہ روپے۔ صفحات ۴۳۸۔

گذشتہ نصف صدی میں امتِ مسلمہ کے غم خواروں، بہی خواہوں اور رہنماؤں میں جن چند ہستیوں کے نام ملتے ہیں اُن میں نواب بہادر یار جنگ کا اسم گرامی خاص امتیاز کا حامل ہے۔ نواب صاحب مرحوم نے

ایک نہایت ہی امیر گھرانے میں آنکھیں کھولیں، ناز و نعمت میں پل کر جوان ہوئے مگر اس طبقے کے دیگر افراد کے برعکس حکومت کے ایوانوں میں عزت و ناموری حاصل کرنے کے بجائے عوام کی خدمت کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ نواب صاحب کے یہ خطوط اُن کی انسانیت دوستی، ملّت کی غم خواری اور اُن کی نیک نفسی، پاکبازی اور سیر چشمی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ بہادر یار جنگ اکادمی نے ان خطوط کی ترتیب و تدوین میں بڑی عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے اور انہیں نہایت اونچے طباعتی معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔

---

## (بقیہ اشارات)

افکار کو موقع بے موقع اُچھالا جاتا ہے اور پھر تھوڑی سی اجتماعی قوت فراہم کرکے تشدّد کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کو عوامی احساسات کا قطعاً کوئی پاس نہیں ہوتا اس لیے یہ مختلف طبقات کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق عجیب و غریب تجربات کرتے رہتے ہیں اور پھر ان تجربات کو ترغیب و تلقین کے ذریعے نہیں بلکہ قوت کے بل پر نافذ کرتے ہیں۔ ماؤ نے اپنی مختلف تحریروں میں ان دو حقائق کا بڑے کھلے الفاظ میں ذکر کیا ہے

"سوشلسٹ نظام ایک خارجی اصول ہے جو انسان کی مرضی سے آزاد ہے"۔ (تعلیمات ماؤزے تنگ ص۲)

"انقلاب کسی دعوت میں لوگوں کو مدعو کرنا، کوئی مقالہ لکھنا یا تصویر بنانا یا کشیدہ کاری کرنا تو نہیں ہے۔ یہ کسی طرح بھی شائستہ، خاموش، نرم، بامروت، منضبط اور فیاضانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ انقلاب تو ایک ہنگامہ ہے، تشدد کا ایک فعل ہے جس کے ذریعے ایک گروہ دوسرے گروہ کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ تشدد کے بعض کام جنہیں (ہونان میں کسان تحریک کے متعلق ایک تحقیقی رپورٹ میں) زیادتی سے تعبیر کیا گیا ہے وہ اس قوت کا مظہر ہے

جو کسانوں میں اس انقلاب نے پیدا کی ہے - یہ اقدامات کسانوں کی تحریک کے دوسرے دور میں ناگزیر تھے - اس دور میں یہ ضروری تھا کہ کسانوں کی بلا شرکت غیرے حکومت قائم کی جاتی، کسانوں کی تنظیم کے خلاف پراپیگنڈا کو ختم کیا جاتا، اشراف کے اقتدار کا خاتمہ ہوتا، اسے ملیامیٹ کیا جاتا اور پیر پاؤں کے نیچے روندا جاتا - جن افعال کو زیادتی کہا گیا ہے وہ انقلابی نوعیت کے ہیں - اسے ذرا کھلے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر علاقے میں دہشت کا ایک مختصر دور لازمی تھا - ایک برائی کے خاتمے کے لیے معقول حدود سے گذرنا ہی پڑتا ہے اور جب تک ان جائز حدود کو توڑا نہ جائے برائی مٹائی نہیں جا سکتی۔" (منتخب تحریریں جلد ۱ ص ۲۷)

یہ ہے انقلاب کا وہ طریق جس کی اشتراکیت علمبردار ہے - اسی طریق کار کے مطابق پہلے روس میں تغیرات لائے گئے اور اب چین کو زیر و زبر کیا جا رہا ہے - قارئین کو مندرجہ بالا اقتباس پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ماؤ صاحب ہونان کی جس کسان تحریک کی رپورٹ پر تبصرہ فرما رہے ہیں اُس کا تعلق اس علاقے سے ہے جہاں انقلاب سے پہلے مسلمان کثیر تعداد میں آباد تھے اُن پر جو خوفناک مظالم ڈھائے گئے انہیں خود اشتراکیت کے رہنماؤں کی رپورٹ میں زیادتی (GOING TOO FAR) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے - ماؤ صاحب اسی کے حق میں جواز پیش فرما رہے ہیں -

---

میں ظلمتِ شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا (اقبال)

سیّد قطب شہیدؒ نے

# جادہ و منزل

ترجمہ: معالم فی الطریق

اس درماندہ کارواں کیلئے

میں اپنے خون کی سرخی سے نشان ہائے راہ اُجاگر کیے ہیں۔

ایک ایسی انقلابی کتاب

جس کی ابتداء قید خانہ میں کی اور انتہا تختۂ دار پر

خلیل احمد حامدی

نے اس کو شگفتہ اُردو میں پیش کیا ہے۔ اور ساتھ ہی مصنّف کے مفصل حالاتِ زندگی اور مقدمہ کی رُوداد بھی بیان کی ہے

یہ کتاب

کاروانِ حق کے لیے صدیوں رہنمائی کرے گی

آفسٹ کی نفیس طباعت۔ صفحات ۲۳۶ — قیمت اعلیٰ ایڈیشن -/۷ روپے۔ سستا ایڈیشن -/۴ روپے